فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۴۰

ماہ جولائی ۱۹۸۷ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۰

ماہ جولائی ۱۹۸۷ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی:)

جلد ۱۴۰ ماہ ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۶ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

۲۹ جون ۱۹۸۶ء سے یکم جولائی ۱۹۸۶ء تک پاکستان کی ہجرہ کانسل کی مشاورتی کمیٹی کا ایک سیمنار اسلام آباد میں تھا، جس میں ہندوستان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ یہ خاکسار بھی مدعو تھا، اس میں اسلامی علوم و فنون پر سو عظیم کتابوں کا انتخاب کرنا تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، وہ الحمد للہ پہلے سے اب بہت اچھے ہیں، لیکن کمزوری ابھی تک باقی ہے، مزید علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ذات گرامی کا سایہ ملک و ملت پر تادیر قائم رکھے، تاکہ ان سے جو مذہبی، علمی اور ملی سرچشمہ بہہ رہا ہے اس سے لوگ فیض یاب ہوتے رہیں، آمین۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی بعض اسباب کی بنا پر اسلام آباد نہ پہونچ سکے، ہندوستان کی نمایندگی صرف اسی خاکسار کو کرنی پڑی، اس میں تقریباً ۳۲ ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے، اس کا افتتاح پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا، صدر محترم اور نمایندوں کا خیر مقدم ہجرہ کانسل کے صدر اور پاکستان کے مشہور ایڈووکیٹ اور صاحب نظر و فکر اہل علم جناب اے۔ کے۔ بروہی نے کیا، اس ہجرہ کانسل کے خاص مشیر اور ہر کام کو انتہائی خوش سلیقگی، تن دہی اور بالغ نظری سے کرنے والے جناب نبی احمد بخش بلوچ ہیں، جو اپنی دل نواز متحرک شخصیت کی وجہ سے اس سے پہلے کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اس کانسل کے سکریٹری ڈاکٹر معز الدین ہیں جو پہلے پاکستان کی اقبال اکیڈمی کے جنرل سکریٹری اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال چیر کے وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے ہیں، اب ہجرہ کانسل کی تجویزوں کو کامیاب بنانے کے لیے ان کی خدمات اس میں لے لی گئی ہیں، ان کو ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام تک پہونچانے میں بڑی مہارت ہے۔

اس سیمنار کی تقریبیں پاکستان کی دیرینہ روایات کے ساتھ تزک و احتشام، دھوم دھام، مہمانوں اور نمایندوں کی پوری خاطر داری، دل نوازی اور دلجوئی کے ساتھ انجام پائیں، شروع کے دو روز کی تقریبیں اسلام آباد میں ہوئیں، آخری روز اس کی ایک نشست نتھیا گلی میں ہوئی، جہاں سرکاری حکام نے نمایندوں کا خیر مقدم کیا، افسوس کہ بعض اسباب کی بنا پر اس میں شرکت نہ کرسکا، اس سیمنار میں اسلامی علوم و فنون پر جو سو

کتابیں بحث و مباحثہ کے بعد منظور ہوئیں ان کے نام یہاں پر اس لیے درج کیے جا رہے ہیں کہ ہمارے قارئین بھی اس انتخاب سے باخبر ہوکر اپنی عظیم الشان علمی وراثت سے واقف ہو جائیں، جس فن وار طریقہ سے ان کتابوں کی فہرست تیار کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

---

(۱) قرآنی علوم: الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی (۲) علوم حدیث: سرد الصحائف (نسخۂ خطیہ) (۳) مقدمہ فی علوم الحدیث، ابن الصلاح (۴) فن تصوف: کتاب اللمع، ابونصر السراج (۵) کشف المحجوب، شیخ ابوالحسن علی ہجویری (۶) کیمیائے سعادت، الغزالی (۷) اخلاقیات: کتاب تہذیب الاخلاق، ابن مسکویہ (۸) تقابل مذاہب: کتاب الملل والنحل، شہرستانی (۹) تعلیمات: الرسالۃ المفصلۃ لاحوال المتعلمین واحکام المعلمین، القابسی (۱۰) ایہا الولد، الغزالی (۱۱) تعلیم المتعلم وطریق التعلم، الزرنوجی (۱۲) تذکرۃ السامع والمتکلم، ابن جماعہ (۱۳) مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ طاش کبریٰ زادہ (۱۴) جامع بیان العلم وفضلہ، ابن عبدالبر (۱۵) فہرست کتب: الفہرست، ابن الندیم (۱۶) فلسفہ: کتاب فی الفلسفۃ الاولیٰ، الکندی (۱۷) رسالہ حی ابن یقظان، ابن طفیل (۱۸) نفسیات: کتاب النفس، ابن باجہ (۱۹) کتاب النفس والروح وشرح قواہما، الرازی: (۲۰) منطق، طبیعیات، فلسفہ وکلام: کتاب الاشارات والتنبیہات ابن سینا (۲۱) رسائل اخوان الصفا وخلان الوفا، الرسالۃ الجامعۃ (۲۲) محصل افکار المتقدمین والمتاخرین، فخر الدین رازی (۲۳) الکتاب المعتبر فی الحکمۃ الالٰہیۃ، ہبۃ اللہ (۲۴) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی، (۲۵) المواقف فی علم الکلام، عضد الدین الایجی (۲۶) معیار العلم، الغزالی (۲۷) حکمۃ الاشراق، شہاب الدین سہروردی (۲۸) شواہد الربوبیۃ، صدر الدین شیرازی

---

(۲۹) خوابوں کی تعبیر: خلاصۃ الکلام فی تاویل الاحکام، جلال الدین شیرزی یا کتاب القادری فی التعبیر، ابوسعید نصر الدینوری (۳۰) سیاسی افکار ونظام: رسالہ فی آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، الفارابی (۳۱) الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ابن القیم الجوزی (۳۲) کتاب الاموال، ابوعبید (۳۳) کتاب الوزراء والکتاب، الجہشیاری (۳۴) معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ، ابن الاخوۃ، (۳۵) تجارت: کتاب الاشارۃ الی محاسن التجارۃ، ابوالفضل جعفر الدمشقی (۳۶) کاروان کے

راستے اور ڈاک کا نظام: کتاب المسالک والممالک، ابن خردازبہ (۳۷) فقہی قوانین: بدایۃ المجتہد، ابن رشد (۳۸) البحر الزخار، زیدی (۳۹) کتاب الہدایۃ، مرغینانی (۴۰) الرسالۃ، الشافعی (۴۱) الاصول، البزدوی (۴۲) کتاب الاشباہ والنظائر، ابن نجیم (۴۳) کتاب الفروق الکرابیسی (۴۴) الاحکام فی تمییز الفتاویٰ عن الاحکام، القرافی۔

(۴۵) قانونی فلسفہ: الموافقات، الشاطبی (۴۶) دستوری قانون: الاحکام السلطانیۃ الماوردی (۴۷) بین الاقوامی قانون: کتاب السیر الصغیر، الشیبانی یا نہایۃ الرتبہ، عبدالرحمٰن بن نصر شیرزی (۴۸) سوانح حیات: السیرۃ، ابن ہشام (۴۹) وقائع نگار کی ذاتی دیانتداری پر مبنی: کتاب العلل ترمذی یا الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل، عبدالحی لکھنوی (۵۰) تاریخ: فتوح البلدان البلاذری (۵۱) علاقائی تاریخ: فتح نامۂ سندھ (۵۲) تاریخ خلیفہ ابن خیاط (۵۳) خاندانی تاریخ: طبقات ناصری، منہاج سراج (۵۴) عمومی تاریخ: کتاب البدء والتاریخ، ابن مطہر المقدسی، یا تجارب الامم، ابن مسکویہ (۵۵) ایک خاص علاقہ کی تاریخ: المعجب فی تاریخ المغرب، المراکشی، (۵۶) ایک خاص شہر کی تاریخ: اخبار مکہ، الازرقی۔

---

(۵۷) فن تاریخ نویسی: الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ، السخاوی (۵۸) قومی معاشرہ: طبقات الامم، ابن صاعد الاندلسی (۵۹) زبان: الصاحبی فی فقہ اللغۃ، ابن فارس اللغوی (۶۰) حضریات: ادب الدنیا والدین، الماوردی (۶۱) مطالعۂ ثقافت: کتاب ما للہند، البیرونی (۶۲) مروج الذہب ومعادن الجوہر، المسعودی (۶۳) تاریخ اور عمرانیات کا فلسفہ: المقدمۃ، ابن خلدون (۶۴) الامتاع والموانسۃ، ابوحیان التوحیدی یا العقد الفرید، ابن عبد ربہ یا المقدمۃ الجزریۃ، شمس الدین الجزری یا ارشاد الادیب، یاقوت (۶۵) شعر: نقد الشعر، قدامۃ بن جعفر (۶۶) فن کتابت: کتاب جامع محاسن کتابۃ الکتاب یا الرسالۃ فی علم الخط، سیوطی (۶۷) عرب ایرانی، ترکی موسیقی: کتاب الادوار، صفی الدین الارموی (۶۸) موسیقی مرزا جان (۶۹) افسانہ ماۃ لیل ولیلۃ (۷۰) طیف الخیال، محمد بن دانیال الموصلی۔

---

(۷۱) علم کائنات و احوال عالم، جغرافیہ وغیرہ: انشاء الدوائر، ابن العربی،

(۷۲) نہایۃ الادراک، قطب الدین شیرازی (۷۳) نخبۃ الدہر، الدمشقی (۷۴) حدود العالم، (۷۵) کتاب صورۃ الارض، ابن حوقل یا احسن التقاسیم، المقدسی (۷۶) سفرنامہ: تحفۃ النظار فی غرائب الامصار، ابن بطوطہ (۷۷) حسابی جغرافیہ: تحدید نہایۃ الاماکن، بیرونی (۷۸) جامع المبادی والغایات، ابوعلی المراکشی (۷۹) کرانولوجی: الآثار الباقیۃ من القرون الخالیۃ، بیرونی۔

(۸۰) معدنیات: کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر، بیرونی (۸۱) نباتیات: کتاب النبات، ابوحنیفہ الدینوری (۸۲) حیوانیات: کتاب حیاۃ الحیوان الکبریٰ، الدمیری (۸۳) طبیعیات کتاب المناظر، ابن الہیثم یا تنقیح المناظر، کمال الدین فارسی (۸۴) کتاب میزان الحکمۃ، الخازنی، (۸۵) کیمیا: کتاب الاسرار، رازی (۸۶) نجوم: علم الفلک، البتانی یا مقالید علم الہیئۃ، بیرونی یا ملخص تذکرۃ فی الہیئۃ للطوسی (۸۷) صور الکواکب، عبدالرحمٰن الصوفی (۸۸) المراصد وآلات الرصد

---

(۸۹) سائنسی علوم کا انسائیکلوپیڈیا: کتاب النجاۃ، ابن سینا (۹۰) ریاضی: مفتاح الحساب، غیاث الدین الکاشی یا خلاصۃ الحساب، العاملی یا تلخیص عمل الحساب، ابن البناء المراکشی یا نقہ الحساب، ابن عبدالمنعم (۹۱) حسابیات: تحفۃ الاعتماد، ابن حمزۃ المغربی (۹۲) اقلیدس اور علم مثلث: المثلثات، بیرونی یا فی شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس، عمر خیام، یا الرسالۃ نصیر الدین طوسی (۹۳) کتاب التحلیل والترکیب، ابن الہیثم یا کتاب التحلیل والترکیب، ابراہیم بن سنان (۹۴) الجبرا: کتاب الجبر والمقابلۃ، خوارزمی (۹۵) کتاب شکل القطاع نصیر الدین طوسی (۹۶) علم طب: القانون، ابن سینا (۹۷) کتاب شرح تشریح القانون، ابن النفیس (۹۸) جراحی: التصریف لمن عجز عن التالیف، ابوالقاسم الزہراوی (۹۹) امراض چشم: العمدۃ النوریۃ فی الامراض البصریۃ۔

(۱۰۰) امراض سینہ: کتاب الادویۃ القلبیۃ، لابن سینا وللرازی (۱۰۱) کتاب الجدری والحصبۃ، الرازی (۱۰۲) طریقۂ علاج و تغذیہ: التیسیر فی المداواۃ والتدبیر، ابن زہر یا کتاب الاغذیۃ، ابن زہر (۱۰۳) میٹریا میڈیکا: المعتمد فی الادویۃ المفردۃ، الملک المظفر یوسف بن عمر صاحب الیمن (۱۰۴) علم الادویۃ: کتاب الصیدنہ، بیرونی (۱۰۵) کامل الصناعتین، ابن البیطار (۱۰۶) پیشۂ طب: عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ (۱۰۷) اخلاق الطبیب، الرازی۔

---

(۱۰۸) زراعت: کتاب الفلاحۃ، ابن عوام (۱۰۹) باغبانی: کتاب بغیۃ الفلاحین فی الاشجار الثمرۃ والریاحین، عباس بن علی ملک الیمن (۱۱۰) کتاب الازمنۃ والانوار، الاحدابی (۱۱۱) کتاب انباط المیاہ الخفیۃ، الکرجی (۱۱۲) ٹکنالوجی: الجامع بین العلم والعمل النافع فی صناعۃ الحیل، الجزری (۱۱۳) کتاب الحیل، بنو موسیٰ (۱۱۴) گھڑی سازی: علم الساعات والعمل بہا، رضوان بن محمد خراسانی یا کتاب فی علم الساعات، عبدالکریم ساعاتی (۱۱۵) بحریات وجہاز رانی: کتاب الفوائد فی اصول البحر والقواعد ابن ماجد یا العمدۃ المہریۃ، سلیمان المہری (۱۱۶) فنون حرب: مشارع الاشواق الی مصارع العشاق، احمد بن ابراہیم الدمشقی (۱۱۷) فن تعمیرات: تاج محل کے رسالے اور سنان کا رسالہ۔

ان ہی میں سے سو کتابوں کے اصل متن محنت سے ایڈٹ کرکے شایع کیے جائیں گے، اور پھر ان کے انگریزی ترجمے کیے جائیں گے، تاکہ غیر مسلموں کو اور خصوصاً انگریزی جاننے والوں کو یہ علم ہو کہ مسلمانوں نے دنیا کے علوم و فنون کو کس کس طرح مالا مال کیا، ان کتابوں کے انتخاب میں بڑی دیدہ وری، محنت اور خوش مذاقی کا ثبوت دیا گیا ہے، ہمارے ناظرین اس فہرست پر ایک نظر ڈال لیں گے تو ان کو فخر محسوس ہوگا کہ ہمارے اسلاف نے دنیا کے کسی بھی علم اور فن کو جاننے اور اس پر عبور حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی، اگر ان کو یورپ اور امریکہ کے پروپیگنڈہ کی طرح عام کیا جاتا تو دنیا کے مسلمان احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کے بجائے احساس برتری کا جذبہ رکھتے۔

اس سمینار کے موقع پر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ہندوستان سے اپنی خیر سگالی کے جذبہ کے اظہار کی خاطر اس خاکسار کی طرف خاص توجہ فرمائی، ایوان صدر میں طلب کرکے بڑی خندہ پیشانی سے ملے، کچھ دیر تک باتیں کیں، انھوں نے دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے سیرۃ النبی جلد ہفتم پر ایک لاکھ روپے کا جو انعام پہلے عطا کیا تھا، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے قرآن مجید کے ایک خوبصورت مطبوعہ نسخہ کے ساتھ بہت سی کتابیں ازراہِ علم نوازی تحفہ میں پیش کیں، دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کی بھی عزت بخشی، جس میں زیادہ تر علمی اور معاشرتی گفتگو ہوتی رہی۔

اس اجتماع میں جہاں اور ملکوں کے معزز نمایندوں سے ملاقاتیں رہیں وہاں اپنی زندگی کے عزیز ترین لمحات مکرم و محترم ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی صحبتوں میں گذرے جن میں بڑی علمی روحانیت محسوس کرتا رہا، چار روز کا زیادہ تر

وقت ان ہی کی ہمدمی اور ہمنشینی میں گذرا، ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ جوان تھے، اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، آلۂ سماعت استعمال کرتے ہیں، لیکن باتوں اور تحریروں میں اب تک جوان رعنا ہیں، انھوں نے اپنی زندگی میں جتنے علمی کام کیے ہیں وہ ان کے بعد اسی طرح یاد کیے جائیں گے جس طرح اکابر و مشاہیر مصنفوں کے کارنامے یاد کیے جاتے ہیں، پھر اپنے استغنا اور بے نیازی کی مثالیں بھی ایسی پیش کی ہیں جو گذشتہ دور میں ایمۂ اسلام پیش کرتے رہے ہیں، اور جن سے ہمارے ماضی کی عظمت میں تابانی اور درخشانی پیدا ہوئی ہے، پاکستان ہجرہ کانسل کی طرف سے ان کی خدمت میں دس لاکھ روپے کا انعام پیش کیا گیا، مگر انھوں نے اسی وقت اسلام آباد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ہدیہ کردیا، ایسی بے نیازی کی مثالیں کم ملیں گی، ان کا مستقل قیام پیرس میں ہے، وہاں وہ کوئی غیر معمولی راحت اور عشرت کی زندگی بسر نہیں کرتے جس سے ان کو روپے کی ضرورت نہ ہو، مگر اپنی قناعت پسندانہ اور خود دارانہ زندگی میں ان کو جو ماہانہ پنشن ملتی ہے اسی میں زندگی بسر کرنے میں وہ روحانی نشاط و انبساط محسوس کرتے ہیں، جس کے بعد ان کے لیے بڑی سے بڑی دولت کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں، مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرلی ہے، لیکن شبستان محبت میں حریر و پرنیاں بنے ہوئے ہیں، عشق اسلام کے مضراب سے ان کے علمی تار حیات کا جو نغمہ بلند ہو رہا ہے وہ نہ صرف ان کے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے نور حیات بنا ہوا ہے، اقبال نے مرد مومن کی جو یہ تعریف کی ہے کہ اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل، اس کی ادا دلفریب اور اس کی نگہ دلنواز ہوتی ہے، تو اس کا مکمل نمونہ ان کو اپنی بار بار ملاقاتوں میں پایا، وہ یاد آرہے ہیں، ان کی صورت جنت نگاہ اور باتیں تسنیم سامعہ بنی ہوئی ہیں اور آیندہ زندگی میں بھی بنی رہیں گی، دارالمصنفین کے رسالہ معارف کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کے متعلق اپنی جو رائے ظاہر کی وہ ہمارے لیے بہت بڑی سند ہے۔

اسلام آباد میں جناب حکیم محمد سعید نے ڈاکٹر حمید اللہ کے اعزاز میں اپنی ایک نئی شاندار ہمدرد بلڈنگ میں شام ہمدرد منعقد کی تو اس میں جناب محمود غازی کے علاوہ ڈاکٹر حمید اللہ، جناب اے۔ کے بروہی اور بریگیڈیر گلزار احمد کی دلپذیر تقریریں سننے میں آئیں، یہیں جناب محی الحق صاحب سے ملاقات ہوئی جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں شبلی منزل میں رہ چکے ہیں، اب پاکستان کی حکومت

کے کیبنٹ ڈویژن کے جوائنٹ سکریٹری ہیں، اسلام آباد میں جناب عبدالواحد ہالی پوتا محبت و اخلاص کے پیکر بن کر ملتے رہے، پہلے وہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے، آج کل پاکستان کی کونسل آف اسلامک آئیڈیولوجی کے صدر ہیں، ان کی کونسل نے بینک کے سودی کاروبار کو ختم کرنے اور عدلیہ کا نظام قائم کرنے کی جو سفارشات کی ہیں اس کے دو نسخے عطا کرکے کرم فرمایا، ڈاکٹر محمد سلیم اختر پرنسپل ریسرچ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ نے تذکرہ مجمع الشعراء جہانگیر شاہی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے رسالہ نوریہ سلطانیہ کے مطبوعہ نسخے پیش کیے جو انھوں نے بڑی محنت سے ایڈٹ کرکے شایع کیے ہیں، ڈاکٹر احمد حسن خان اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد نے خلق الانسان فی اللغۃ لابی محمد الحسن بن احمد بن عبدالرحمٰن کا ایک نسخہ نذر کیا جس کو انھوں نے ایڈٹ کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جنرل ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد زمان بڑی علم دوستی کے ساتھ ملتے رہے، جناب محمود غازی اب انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، ان کا عزیزانہ برتاؤ برابر ساتھ رہا، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی سابق اڈیٹر فکر و نظر نے بھی ہر وقت رفاقت کی، راولپنڈی کے ظروف آہنی اور زنگ سازی کے تاجر جناب محمد شفیع نے اس خاکسار سے ملنے کی جس تڑپ کا اظہار کیا، اس سے ان کا بہت ممنون ہوا، وہ ۱۹۶۳ء سے معارف کے پرانے پرچوں کے خواہاں ہوئے

کراچی میں بھی چند روز قیام رہا، وہاں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ کی تشویشناک علالت کے سلسلہ میں ان کے صاحبزادے عزیزی محمد سہیل، ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور ان کے پورے خاندان کو بہت ہی مضطرب پایا، ایک روز میری قیام گاہ پر وہاں کے ایک ٹیکسٹائل مل پاکولا اور پیپسی جیسے مقبول اور مشہور مشروبات کے ہر دلعزیز مالک جناب حاجی علی محمد صاحب نے محض علم نوازی کی خاطر جناب بنی دالا، جناب مولانا عبدالشکور اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ جناب غلام محمد کے ساتھ تشریف لاکر میری عزت بڑھائی، کئی گھنٹے اپنی صحبت سے استفادہ کا موقع دیا، جس میں زیادہ تر مذہبی گفتگو ہوتی رہی، اس نشست میں مولانا ناظم ندوی بھی شریک رہے، ایک رات وہاں کے مشہور ایڈوکیٹ جناب خالد اسحاق صاحب نے اپنے یہاں ایک مخصوص مجلس میں مدعو کیا، ان کی مجلس کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ علمی بذلہ سنجیوں اور مطایبات سے زعفران زار بن جاتی ہے، ان کے ذاتی کتب خانہ میں اس وقت سوا لاکھ کتابیں ہیں، ان ہی کے درمیان بیٹھ کر اپنی درازیٔ عمر کا سامان کیے ہوئے ہیں،

ایک روز تاج محل ہوٹل میں فاران کلب انٹرنیشنل کے فعال، سرگرم اور اسلام نواز صدر جناب عبدالرحمٰن چھاپرا صاحب نے ایک بہت ہی منتخب مجمع میں اسلام اور مستشرقین پر ایک تقریر کرائی، اس اجتماع میں جناب علی محمد صاحب نے بھی محض میری محبت میں شریک ہوکر میری تقریر سننے کی زحمت گوارا کی، اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ظہیر الدین محمد بابر کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑے بڑے بہادرانہ کارنامے انجام پائے، لیکن میری نظر میں میری سب سے بڑی بہادری یہ تھی کہ ایک روز لڑائی میں شکست کھاکر جنگل میں سو گیا تھا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا سانپ میرے سینہ پر کنڈلی مار کر میرے منہ پر پھنکار مار رہا ہے، یہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، لیکن یکایک سنبھلا، اور جب اس نے پھنکار مارنے کے لیے منہ بڑھایا تو میں نے اپنے اوپر نیچے دونوں دانتوں سے اس کا سر دبا لیا، اور تیزی سے کھڑے ہوکر اس کو ایک طرف جھٹک کر پھینک دیا، پھر اپنی تلوار سے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، یہ واقعہ سنا کر سامعین سے عرض کیا کہ مستشرقین مسلمانوں کے سینہ پر کنڈلی مار کر پھنکار رہے ہیں، اس سانپ کو اسی طرح مارنا ہے جس طرح بابر نے مارا تھا، مگر ایسی بہادری تو مسلمان اپنی تن آسانی اور غفلت شعاری سے شاید نہ دکھا سکیں، لیکن ہمارے مسلمان پارٹ ٹائم مسلمان بننے کے بجائے فل ٹائم مسلمان بن کر زندگی بسر کریں تو مستشرقین کے تمام وار خالی جائیں۔

موتمر العالم الاسلامی کے دفتر کی نئی عمارت کا افتتاح صدر پاکستان نے کیا تو اس موقع پر اس کے جنرل سکریٹری جناب انعام اللہ خان اور اس کے دوسرے عہدیداروں میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اور مولانا ثمنیؒ ندوی سے بھی ملاقاتیں رہیں، مولانا ثمنیؒ ندوی میری حقیر تالیف بزم صوفیہ کے خواہاں ہوئے، اتفاق سے وہ میرے پاس تھی، میں نے ان کو یہ کہہ کر نذر کی کہ وہ اس کا مطالعہ کریں تو یہی

میری محنت کا صلہ ہوگا، شمالی ناظم آباد کے جناب شمس الدین حنفی صاحب قالین والے نے بھی معمول کے مطابق ہر طرح کی تواضع کی اور سیرۃ نبوی پر جناب ضیاء الدین کرمانی کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ ابدی پیغام کے آخری پیغمبر کا ایک نسخہ ازراہ عنایت پیش کیا، اس پر مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا بڑا پرمغز مقدمہ ہے، کراچی کے قیام میں عزیزی افضال مبین اور مولانا شبلی کے اعزہ میں جناب سہیل سلطان اور محمود سلطان نے ہر طرح کا حسن سلوک کیا، ایک رات دیسنہ کے سابق ہم وطنوں کو مختصر سی تقریر کر کے مخاطب کرنے کا موقع ملا، اس کے میزبان میرے یار عزیز سعید الحق مرحوم کے چھوٹے بھائی حفیظ الحق تھے، کراچی میں جناب جمیل عظیم آبادی نے اپنے حمدیہ اور نعتیہ کلام کا بہت عمدہ چھپا ہوا نسخہ بھیج کر ممنون کیا۔

کراچی میں دہلی، مدھیہ پردیش، یوپی اور بہار کے جو لوگ آباد ہیں وہ بڑے پیمانہ پر ایک سو اسی ایکڑ زمین پر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی یاد میں **سلیمان فاونڈیشن** قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس کے عہدیداران اور اراکین مختلف اوقات میں اس کی تاسیس اور تنظیم کے سلسلہ میں میرے پاس آکر مشورے کرتے رہے، اس میں وہ دارالمصنفین، کتب خانے، مدارس، بچوں کو تفریح کے ذریعہ تعلیم دینے کے مراکز، چھاپہ خانہ، کمیونٹی ہال، ایک اسپتال اور بینک وغیرہ قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کی تکمیل کے لیے پچاس کروڑ روپیے کے مصارف کا تخمینہ ہے، اندازہ ہوا کہ یہ کام بہت آگے بڑھ چکا ہے، دعا ہے کہ یہ فاونڈیشن قائم ہو کر حضرت الاستاذ کی شان اور رتبہ کے مطابق مفید کام انجام دیتا رہے، آمین، ان کی سیرت کے نمایاں پہلو یہ تھے کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی روایت کی حفاظت و حرمت میں اپنی پوری زندگی گذاری، لیکن کبھی کسی چیز کو ادنی مقصد کے حصول میں کام میں نہیں لاتے تھے، وہ ہر کام کو اپنی پاکیزہ دانش بینش سے نہایت شریفانہ، مخلصانہ اور دیانت دارانہ طور پر انجام دیتے تھے، امید کہ ان کے یہ اوصاف سلیمان فاونڈیشن کے ہر کام کو انجام دینے میں کارفرما رہیں گے، یہ بھی واضح رہے کہ وہ نہ صرف ایک بہت بڑے محقق اور نامور مصنف تھے بلکہ بیسویں صدی میں اس برصغیر کے مسلمانوں کی سوسائٹی کے ذہن و فکر میں خواہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، انقلاب لانے میں اپنی ذات سے ایک تحریک بن گئے تھے، امید کہ یہ فاونڈیشن اپنی سرگرمیوں میں اسی تحریک کی صحیح ترجمانی کرتا رہے گا۔

مقالات

اسلام کی معاشرتی زندگی، مستشرقین کی نظر میں

از

ڈاکٹر عبدالوہاب ابو حدیبہ، ڈائرکٹر مرکز الدراسات والابحاث الاقتصادیہ والاجتماعیہ تونس

ترجمہ۔ حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی، رفیق دارالمصنفین

(۲)

ریمنڈ چارلس کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ذہن یک طرفہ اور جانب دارانہ واقع ہوا ہے، وہ اسلام کے کامیاب نظام زندگی اور اس کے نظریات کی جانب سرے سے کوئی اعتنا نہیں کرتے، اور بار بار یہ کہتے ہیں کہ نظریۂ اجتماعیات کو اسلامی فقہ نے شروع سے جامد کر رکھا ہے، اس لیے وہ جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، ان کا خیال ہے کہ مسلمان غیر قوموں سے متعلق قوانین کا لحاظ نہیں کرتے اور ان پر بھی اسلامی قوانین کو منطبق کرتے ہیں، فقہ اسلامی کا دعوی تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط و شامل ہے، لیکن سیاسی اور تنظیمی اداروں کے بارہ میں وہ کوئی اہتمام اور رہنمائی نہیں کرتی ہے، تجارت اور سزاؤں کے معاملات کے ایک بڑے حصہ سے وہ صرف نظر کرتی ہے۔

چارلس اپنے اس مطالعہ میں فقہ اسلامی کی خامیوں کی اصل وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

مسلمان ہر حالت میں اپنی شریعت یا اسلام کا تحفظ چاہتے ہیں، ان کے اس اصرار کی وجہ سے فقہ اور اس کے اصول و قواعد میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اور وہ مختلف عیوب و نقائص کا مجموعہ ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جامد، بے حس اور زندگی سے محروم ہے۔

چارلس نے اپنے نظریات کے اثبات اور واقعات کو مسخ کر کے پیش کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، فقہ اسلامی کے مختلف دور گذرے ہیں اور مسلمانوں کا معاشرہ زمانہ کے ساتھ ارتقاء اور تبدیلیوں کی مختلف منزلوں سے گذرتا رہا ہے، ان باتوں کا جائزہ انھوں نے اپنی فہم و معرفت اور خاص نقطۂ نظر کے مطابق لیا ہے، لیکن یہ کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ فقہ کی از سر نو تشکیل کی جو جدوجہدانہ کوششیں کی گئیں، اور تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا جو حل تلاش کیا گیا ان کا انھوں نے کوئی جائزہ نہیں لیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اسلام کی روح اور اس کے مزاج کو انصاف سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے بجائے وہ صرف فقہ اسلامی کی خامیوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے ہیں، کیونکہ ان کی رائے کے مطابق، ترقی اسی وقت ممکن ہے، جب دین اور زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں میں مکمل فصل قائم کر دی جائے۔

اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کی خصوصیات کی وجہ سے انھیں اس کی بالکل امید نہیں ہے کہ زندگی اور دین میں یہ دوری قائم ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ کی شریعت اور انسانوں کی شریعت کو نئے طریقے سے سمجھنے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں حائل ہیں"۔ ان کے نزدیک دین اور زندگی میں تفریق اور دوری کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اسلام کے نظام زندگی سے پوری طرح دستکش ہو کر پیروی مغرب کو اپنا شعار بنائیں۔ لیکن ان کو مسلمانوں کے اندھے تعصب سے اس کی توقع نہیں ہے کہ وہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی گوارا کریں گے، اس لیے وہ پھر مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنی حالت پر قائم رہیں، آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ "ہم کو اصلاحات کے

فوری نفاذ سے باز رہنا چاہیے، . . . . لاکھوں کروروں مسلمانوں کے طرز زندگی اور طریقۂ فکر کو فوری طور پر بدل دینے یا ختم کر دینے کے نتائج بہت خوفناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں اس سے صرف یہ ہو گا کہ مسلمان ذہنی لحاظ سے اور پستی میں چلے جائیں گے"۔ (ص ۲۱۸) اس طرح انھوں نے اپنا آخری فیصلہ یہ صادر کیا ہے کہ "اسلامی معاشرہ ابھی عرصۂ دراز تک فقہ کی پیچیدگیوں میں الجھا رہے گا۔ اور نئے اصول اور زمانہ کے نئے تقاضوں سے وہ متصادم ہوتا رہے گا، خواہ وہ مغرب کے اصول ہوں یا کسی اور جدید قوم کے"۔ ان کے یہ خیالات ظاہری طور پر سنجیدہ بلکہ دانشمندی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت اس سچ کی طرح ہے جس میں باطل کی آمیزش ہوتی ہے، اور اس سے باطل ہی کا اثبات بھی مقصود ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے الفاظ و خیالات کا اظہار ایسے پس منظر میں کرتے ہیں جس میں نہ واقفیت ہوتی ہے، اور نہ حقیقت اور جو علم و عدل کے معمولی معیار تک بھی نہیں پہونچتا ہے، اسلام، فقہ اسلامی اور مسلمانوں کے بارہ میں ان کے الزامات کا مقصد واضح ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ شمالی افریقہ میں فرانس کے جابرانہ اور غاصبانہ قبضہ اور ان علاقوں کے ناجائز استحصال کو وہ جواز عطا کرنا چاہتے ہیں، اور ہر خطا کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلامی شریعت کو بوسیدہ اور فرسودہ قرار دینے کا مقصد یہی ہے کہ ان مقبوضہ علاقوں کے عوام اپنی شریعت اور اپنے قانون سے بیزار اور دستبردار ہو کر اسے مسخ اور برباد کرنے کی فرانسیسی کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھیں اور آسانی کے ساتھ فرانسیسی قانون کو اپنے معاشرہ میں قبول کر لیں۔

لیکن ریمنڈ چارلس کی نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ فقہ اسلامی کے آغاز، اس کے نشو و نما اور اس کے عروج کی تاریخ وہ نہیں ہے، جو انھوں نے پیش کی ہے، اس سے کون صاحب انصاف انکار کرے گا کہ وحی الٰہی نے جو تعلیمات پیش کیں اور جو اصول و مبادی قائم کیے انہی کی بنیادوں پر

مسلمان ائمہ، علماء اور مفکرین نے زندگی اور معاشرہ کے لیے قوانین و ضوابط مرتب کیے ہیں
چارلس کی نظر اس بنیادی بات پر نہیں گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مشکلات کے بجائے
آسانیوں کو پسند کیا ہے، اور خیر و بہبود کے عام پہلو اس کے مدنظر رہتے ہیں، اپنی اصل کے لحاظ سے فقہ،
استنباط اور استدلال کا ایسا عمل ہے، جس کے اثرات، معاشرہ کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، یہ شعبے
خواہ دینی و اقتصادی ہوں یا مادی، جغرافیائی اور نفسیاتی ہوں، فقہ کا رشتہ سب سے ہے، یہ قانون کا
ایسا ادارہ ہے، جو الٰہیاتی قدروں کو روزمرہ کی زندگی میں قائم کر کے اور زمانہ کے تقاضوں سے
ان کو ہم آہنگ کر کے ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ، انسان کی مختلف ضرورتوں
اور تبدیلیوں کو مدنظر رکھتا ہے، اسلام کا نظام ایسے معاشرہ کا ضامن ہے، جو ملکوتی شان کا
حامل ہو، اور اس میں کینہ، بغض، عداوت، حسد، افتراق اور فتنوں کا کہیں گذر نہ ہو، بے شبہ
صدیوں سے دنیا کے کسی حصہ میں اسلام کے نظام جیسی پاکیزہ اور صالح کوششوں کا کوئی سراغ
نہیں ملتا ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ فقہ اسلامی کے نتائج، اثرات اور ثمرات میں فرق اور تفاوت ہے،
اس کی وجہ یہ ہے کہ چودہ سو برسوں سے وہ جن ملکوں اور قوموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، . . .
ذہنی استعداد، رسم و رواج اور اپنے مخصوص ماحول کے لحاظ سے ان میں ایک دوسرے سے بڑا
فرق ہے، اس فطری فرق و اختلاف میں چارلس کو انارکی اور انتشار، کی کیفیت نظر آتی
ہے، لیکن زبان و مزاج کے قدرتی اختلاف کے باوجود بنیادی قدروں کے اتحاد میں ہم کو تو
وحدت اور ہم آہنگی کی فضا نظر آتی ہے، جب چارلس اس خلط ملط کو دیکھتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ
ضروری ہے کہ وہ حقیقت کے ساتھ جدلیت کے عمل کو بھی ملحوظ رکھیں، جب وہ فقہیت کی
بات کرتے ہیں تو پھر ان کو ضمیر کی آزادی کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

مسلمان فقہاء کی تعداد بیشمار ہے، ان میں سے کچھ عبقری ہیں، بعض ان سے کم تر ہیں،
ایسے بھی ہیں، جن سے اجتہادی خطائیں سرزد ہوئی ہیں، بعضوں نے اجتہاد میں راہ صواب پائی
ہے، مگر ان سب کے باوجود اسلامی معاشرہ محض کسی ایک مسلک اور کسی ایک فرقہ کا پابند
کبھی نہیں رہا، ناگزیر اہمیت کے باوجود فقہ کو اسلام کی معاشرتی زندگی کے صرف ایک اہم حصہ
کی حیثیت حاصل رہی، اس کو کبھی مکمل اسلام سے تعبیر نہیں کیا گیا۔

یہ عین ممکن ہے کہ بعض فقہاء نے تحلیل و تجزیہ میں غلطیاں کی ہوں اور بعض صورتوں
میں حالات کو جوں کا توں رہنے دیا ہو اور ان کا حل نکالنے میں ان سے کوتاہی ہوئی ہو، یہ
بھی ممکن ہے کہ چند فقہاء نے اپنی رایوں کے اظہار میں شدت سے کام لیا ہو اور اپنی عقل کا زیادہ
سہارا نہ لیا ہو اور اس کی وجہ سے فقہ پر وقتی طور سے جمود بھی طاری ہو گیا ہو، لیکن اس قسم کی
جزوی اور استثنائی مثالوں کی وجہ سے ہم تمام جلیل القدر فقہاء کی خدمات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے،
جو فکر اسلامی کے مضبوط ترین ستون ہیں، اور جنھوں نے فقہ کو عقلی اور نفسیاتی طور پر اعلیٰ ترین
قانون اور علم کی حیثیت بخشی اور مسلمانوں کے مختلف طبقوں پر اور معاشروں پر ان کا گہرا پائدار
اور دقیع اثر قائم ہوا، ان فقہاء کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کے اثرات صدیوں سے جاری ہیں،
ان کے کارناموں سے کیسے صرف نظر کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ فقہاء جن کے بارہ میں یہ فرض کر لیا گیا
ہے کہ وہ مسائل میں بڑے شدت پسند تھے، اور جن کی وجہ سے فقہ میں جمود کی کیفیت پیدا ہوئی،
ان کے موقف کو بھی اختلاف کے باوجود ہم احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے کہ ان کی احتیاط
دین کی حمایت اور اس میں بیجا قیاس آرائی سے احتراز کا نتیجہ تھی اور اس سے ان کی عظمت اور
ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان ایسے مستشرقین سے جو غاصب اور جارح سامراج کی
ہمنوائی کرتے ہیں ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے ہیں، کہ وہ اسلامی معاشرہ میں کوئی انقلاب لا سکیں گے

ریمنڈ چارلس اور جارج بوسکی کے مقابلہ میں وہ بہرحال محمد عبدہ اور رشید رضا پر اعتماد کو زیادہ پسند کریں گے۔

فقہ اسلامی کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے وقت ریمنڈ چارلس نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ اس میں کسی مسئلہ کے بارہ میں کثرت آراء کا ہونا، ایک پسندیدہ شے ہے، فقہاء کے علمی اختلاف کو اسلام نے رحمت سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ اس سے اس مسئلہ میں زیادہ آسان معقول اور قابل عمل شکلیں سامنے آتی ہیں، جو فقہاء کی وسعت قلب و نظر کا ثبوت ہے، اس کی نظیر نہ یورپ کی قدیم تاریخ میں ملتی ہے، اور نہ موجودہ یورپ میں اس کی کوئی مثال ہے، جہاں اگر پاکیزہ او مقدس افکار کا کبھی ظہور ہوتا ہے، تو آئیڈیا لوجیز کے نام پر ان کے خلاف ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے، اسلامی معاشرہ پر اسلامی اصول و قوانین کا صرف عکس نہیں ہے، بلکہ فقہی علوم کی وجہ سے اس میں اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصول کار فرما دکھائی دیتے ہیں، یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تاریخ کا مطالعہ اس قدر محدود زاویۂ نظر سے کیا جائے،

ریمنڈ چارلس نے اپنی کتاب میں فقہ پر مشق ستم کرنے کے بعد، اسلامی معاشرہ کے دوسرے بڑے عیب "تعصب" کی نشان دہی کی ہے، حالانکہ اس کے متعلق انصاف یہ کہتا ہے کہ اسلام ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا چاہتا ہے جو دینی ذمہ داریوں پر قائم ہو، یہ ذمہ داریاں حریت اور ذاتی ارادہ و اختیار کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہیں، اسلام نے دوسرے آسمانی مذاہب کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا، اور لوگوں کو ایمان و اعتقاد کی آزادی دی، اور اس بات پر زور دیا کہ دین میں کوئی جبر اور زیادتی نہیں، مگر مستشرقین نے حسب عادت ذمیوں کا مسئلہ اٹھا کر غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنے مزاج کے مطابق مسلمانوں اور ان کے زیر اقتدار ذمیوں اور غیر مسلموں کی درجہ بندی اور اکثریت و اقلیت کی بحث کھڑی کر دی، حالانکہ اسلامی معاشرہ میں

نہ طبقہ واریت ہے، اور نہ اکثریت و اقلیت کا کوئی قضیہ ہے، یہ تفریق صرف ان معنوں میں ہے کہ ایک طبقہ نے قرآن و حدیث کی تصدیق کی، اور ان کو اس حیثیت سے قبول کیا کہ یہ دونوں دنیا و آخرت کی فلاح کے ضامن، رشد و ہدایت اور عدل و انصاف کا سرچشمہ ہیں، اس کے برعکس ایک دوسرے طبقہ نے اس عقیدہ پر ایمان رکھا جو ان کو اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں ملا تھا، خود مسلمان خواہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں مسند اقتدار پر فائز ہوں یا اس سے محروم ہوں، اس سے ان کے دین اور اس کے تقاضوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، دوسروں کی معقول باتوں کو قبول کرنے میں جس رواداری کی ضرورت ہے، اس پر بھی کوئی زد نہیں آتی، اور یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم دوسرے قدیم یا جدید معاشروں میں نہیں دیکھتے ہیں۔

اس کے باوجود ریمنڈ چارلس کے نزدیک اسلامی معاشرہ کا متنازعہ فیہ مسئلہ یہی رواداری ہے، جس کا رشتہ وہ تعصب سے قائم کرتے ہیں، اپنی تائید میں وہ ایک اور مستشرق کلاڈ لیوی اسٹراس (Claude levy Strauss) کے اس قول کو نقل کرتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں سے ربط و ضبط کا تصور ہی مسلمانوں کے لیے اذیت ناک ہے، کیونکہ زندگی کے نئے طور طریقے کے مشاہدہ سے قدیم طرز کی ان کی روایتی زندگی میں خلل پڑتا ہے" (ص ۸۰) وہ آگے لکھتے ہیں کہ "ان کی رواداری، اگر اس کا کوئی وجود ہے۔ حقیقت میں صرف اپنی ذات کی بڑائی کے احساس کا دوسرا نام ہے، حریت، مساوات اور رواداری کے نام پر مسلمان صرف ان قدروں پر فخر کرتے ہیں جن کی تلقین قرآن کرتا ہے، پھر یہ لوگ تنہا اپنے آپ کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے اصولوں کو دوسروں پر بھی منطبق کریں، رواداری کا حق بھی وہ اپنے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔ دوسرے کے لیے اس رواداری کے ہر امکان کو وہ فراموش کر دیتے ہیں، اس طرح یہ لوگ رواداری کے لفظ کو اس کے حقیقی معنی سے محروم کر دیتے ہیں"

ریمنڈ چارلس نے اس باب میں ایک طرف تو لیوی اسٹراس کے اقوال کی شہادت پیش کی ہے، اور دوسری طرف انھوں نے ایک اور مستشرق گوبنیو (Gobigneau) سے بھی استفادہ کیا ہے. حالانکہ لیوی اسٹراس، اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں ابتدائی معلومات سے بھی ناواقف ہیں لیکن اس ناواقفیت یا جہالت کے باوجود انھوں نے اپنی کتاب "مَنْس المدارین" (Tristes Tropiques) میں اسلام اور مسلمانوں پر سخت حملے کیے ہیں، اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام وحی کے قطعی اور یقینی ہونے پر جتنا زور دیتا ہے، اس سے زیادہ وہ اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ بیرونی دنیا سے تعلقات استوار کرنے پر اس کو کوئی طاقت حاصل نہیں ہے اہم جب بودھوں یا عیسائیوں سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو اسلام کا تعصب کھل کر سامنے آجاتا ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو تشدد آمیز طریقوں سے اپنے حقائق کے اعتراف پر مجبور کریں، اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ غیر کے وجود کو بحیثیت غیر کے تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں، خود کو شک اور گمان کی ذلت سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے سامنے صرف ایک ہی طریقہ باقی رہتا ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو وہ کالعدم قرار دیں، وہ اپنے ایمان وعقیدہ کی موجودگی میں کسی دوسرے کے عقیدہ کو برداشت نہیں کرسکتے. اسلامی اخوت کا مطلب، کفار کی نفی کے ساتھ دوسرے کا خاتمہ کرنا ہے. اس کے لیے وہ واضح اعتراف کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں، کیونکہ اعتراف کے بعد پھر غیر کا وجود بھی ثابت ہوجاتا ہے. خواہ ضمنی طور ہی پر سہی، مگر مسلمان اس کے لیے بھی تیار نہیں" (ص ۴۳۴)

اس طرح ریمنڈ چارلس نے یورپ کی رواداری کے نام پر اسلامی رواداری کے خلاف فیصلہ صادر کردیا. مگر یہ عجیب بات ہے کہ لیوی اسٹراس کے ساتھ ساتھ انھوں نے گوبنیو کے اقوال سے بھی اپنی کتاب کو مزین کیا ہے، گوبنیو کو نسل پرست نظریات کا امام کہا جاتا ہے

جس کے اثرات نازی اور فسطائی تباہ کاریوں کی شکل میں ظاہر ہوئے، اور جنوبی افریقہ میں ابھی تک اس کے مضر اثرات قائم ہیں، گوبنیو نے وسط ایشیا کے مذاہب اور فلسفوں کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "لوگوں کے عقیدہ کو سب سے کم اہمیت دینے والا مذہب، اسلام ہے. . . . قرآن کی تعلیمات کیا ہیں؟ ان کی حقیقت بس اس قدر ہے کہ کسی بھی حالت میں انسان کے ارادہ واختیار کی اہمیت نہیں ہے. اہمیت صرف اللہ کے ارادہ ومشیت کی ہے، اور اسی کے مطابق وہ ہدایت وگمراہی کی راہیں دکھاتا ہے. . . . تو جب یہی اصول ہے تو پھر مسیحیوں اور یہودیوں کو تبدیل مذہب کے لیے کیسے مجبور کیا جاسکتا ہے"۔

گوبنیو کے ان خیالات کی تحسین کرتے ہوئے ریمنڈ چارلس کہتے ہیں کہ "ان سے غیر مسلموں کے بارہ میں مسلمانوں کے رویہ اور موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، جو حد درجہ منفی اور سلبی ہونے کے علاوہ گمراہوں کو راہ راست پر لانے میں بالکل بے بس ہے. . . . اور آخری بات یہ ہے کہ قرآن اپنی رواداری کو مشروط طور پر پیش کرتا ہے، یعنی پہلے قرآن پر ایمان لاؤ پھر اس کی دی ہوئی رواداری کے مستحق ہو، بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان ایک ہی وقت میں روادار بھی ہیں اور متعصب بھی" (ص ۸۲)

ہم یہاں پھر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ واقعات کی غلط ترجمانی کرنے اور باہم متضاد صورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق ایک ہی موقع پر پیش کرنے میں ریمنڈ چارلس اور ان کے ہمنوا ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتے ہیں، اپنے خیالات کے اثبات میں وہ ایسی روایتوں کو بھی ترجیح سے قبول کرتے ہیں جن کا علمی درجہ نہایت فروتر اور غیر مستند ہوتا ہے، اس کی وجہ بھی وہی ہے، جو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، یعنی وہ مغرب کی موجودہ تہذیب وتمدن کے معیار پر اسلامی معاشرہ اور اسلامی تہذیب وتمدن کو پرکھتے ہیں اور مغرب کی مادی ترقی کی روشنی میں مسلمانوں کی تہذیب کو

پس ماندہ اور کم حیثیت قرار دیتے ہیں، اور پھر مسلمانوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ فلسفہ جدید اور دانش نوی اس مغربی تہذیب کی وہ تقلید نہیں کرتے ہیں، ہم مستشرقین کے اس موازنہ کو غیر علمی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اس تاریخی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں، کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ابتدا سے حریت، رواداری اور احترام آدمیت کی بنیادوں پر اپنے معاشرہ کی دیواروں کو استوار کیا ہے، اور انسانیت کی ان اعلیٰ قدروں کو صحیح مقام عطا کیا ہے۔ اس نے ان اقدار کو نظر انداز کرنے کی یا مٹا دینے کی کبھی کوشش نہیں کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت کی ایسی شریف اور پاکیزہ ترین قدریں اتنی مکمل صورت میں، یورپ بلکہ دنیا کی کسی تہذیب و ثقافت کے ماضی و حال میں نہیں ملتی ہیں، یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ قدیم زمانہ سے آج تک مشرق و مغرب کے نامور فلاسفہ و مفکرین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسلام کی تہذیب انسانیت کے مزاج و خمیر سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ صدہا برس گزرنے کے بعد بھی وہ آج کے معاشرہ میں ہمارے لیے روشنی کا منارہ ہے لیکن رینیڈ چارلس اور لیوی اسٹراس کا علمی پندار اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسلام کی رواداری اور میانہ روی سادہ اور عام فہم ہے، لیکن یہ مستشرقین اس کو الفاظ اور تعبیرات کی پیچیدگیوں میں گم کر دینا چاہتے ہیں، اسی لیے وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ "اسلامی رواداری اصل میں تعصب ہے" اور غیر مسلموں کی تربیت کا اعتراف دراصل ان کو ختم کر دینے کا ایک بہانہ ہے" اس قسم کے خود ساختہ اور مبہم جملے ان کے سطحی علم کی خود شہادت دیتے ہیں۔

رینیڈ چارلس نے اسلامی معاشرہ کے تجزیہ میں جن جزئیات کو شامل کیا ہے۔ اگر ان پر بحث کی جائے تو یہ داستان دراز ہو جائے گی۔ روزمرہ کی زندگی، دینی و سیاسی فرائض، قضا، و تجارت کی زندگی اور خاندان کے مسائل جیسے موضوعات کے ضمن میں انھوں نے ہر جگہ اسی انداز سے بحث کی ہے جس کی نشان دہی ہم اوپر کر چکے ہیں، لیکن خاندان کے مسائل،

شادی بیاہ اور عورت کی حیثیت پر انھوں نے زیادہ شوق اور جوش سے بحث کی ہے۔

کتاب کا پانچواں باب اسی موضوع پر مشتمل ہے جس میں خاندان کے افراد اور قریب اور دور کی رشتہ داریوں پر بحث کرتے ہوئے عام زندگی میں ان رشتوں کی اہمیت اور خاندان و معاشرہ کے وجود و تحفظ کے لیے ان کی موجودگی کو بیان کیا گیا ہے۔ رینیڈ چارلس اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اسلامی خاندان، باپ اور شوہر کی ذمہ داریوں پر قائم ہے لیکن قاری کو اس بات کا انتظار ہی رہتا ہے کہ خاندان میں مختلف لوگوں کے جو فرائض اور واجبات، اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں، اور معاشرہ کے ہر فرد پر جو ذمہ داری عائد کی ہے، رینیڈ چارلس ان کو بیان کریں گے، اسی طرح قرابت داری، صلہ رحمی، اولاد کی پرورش اور تربیت، اقتصادی و معاشی مسائل اور ان کا حل اور خاندان کے تہذیبی و ثقافتی تقاضوں کو بھی وہ پیش کریں گے یا زمانہ جاہلیت کے معاشرہ سے اسلام کو ورثہ میں جو مسائل ملے تھے، ان پر کیسے قابو پایا گیا، اور پھر جب نئے معاشروں سے اسلام کا سابقہ ہوا تو ان کی ثقافتی خوبیوں اور برائیوں سے اسلام کیسے عہدہ برآ ہوا، ان تمام سوالات کو نظر انداز کر کے انھوں نے اسلامی معاشرت کا مقابلہ فرانسیسی طرز بود و باش سے شروع کر دیا۔ اس ضمن میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے قدیم قانون میں یہ بات تھی کہ عورت مرد کی مطیع و فرمانبردار رہے، لیکن انقلاب فرانس نے عورت کو قانونی مساوات دی، اور بیوی کے حقوق کی تعیین کی، اور آخر کار فرانسیسی عورت نے مسلسل جد و جہد کے بعد اپنے حقوق کو حاصل کر لیا ...... لیکن اسلام کا نظام ازدواج اپنی پرانی شکل پر ہی قائم رہا، جو زن و شوہر کے مفادات کو جدا جدا رکھتا ہے، چنانچہ بیوی اپنے شوہر کے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتی ہے دونوں کے مالی معاملات بھی الگ الگ ہیں ...... سچ بات تو یہ ہے کہ عورت اور مرد کی اس دوئی اور تفریق میں غلبہ اور اقتدار، صرف مردوں کا ہوتا ہے، خاندان کے سربراہ اعلیٰ ہونے کی

حیثیت سے مرد، خاندان پر مکمل حاوی رہتے ہیں، عورت کا وجود ضمنی ہوتا ہے، خاندان کا سربراہ باہر کے معاملات کے ساتھ، گھر کی اندرونی ذمہ داریوں کو بھی دیکھتا ہے، گھر کے مالی حالات کا وہی نگہبان ہوتا ہے، اسی مطلق العنانی کی وجہ سے مسلمان خواتین کو سختیوں اور قربانیوں کی زندگی گوارا کرنی پڑتی ہے، اور انھیں میراث سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ (ص ۲۲۵)

رینڈ چارلس کے مذکورۂ بالا خیالات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے، کہ وہ مسلمان معاشرہ کی کسی دقتی یا محدود خامی اور کوتاہی کا ذکر کر رہے ہیں، بلکہ وہ اسلام کے مکمل نظام معاشرت کے بارے میں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ معاشرہ انتہائی سخت گیر ہے اور عورتیں اس میں گویا پابہ زنجیر ہیں جبکہ فرانسیسی عورتیں ان کے مقابلہ میں پوری طرح شاد اور آزاد ہیں، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں وہ معاشرہ کے خاندانی اور مالی مسائل اور ذمہ داریوں کی تقسیم پر بحث کرتے مگر وہ اسلام کے پیش کردہ حلال اور حرام امور میں بھی فرق نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی بحث کے علمی اور غیر جانبدارانہ ہونے کے مدعی ہیں، لیکن یہی دونوں خوبیاں ان کی کتاب میں یکسر مفقود ہیں، اسلامی معاشرہ کو اس درجہ بدترین اور مکروہ صورت میں پیش کرنے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اصلاً سامراجی قوموں کے غلبہ اور تسلط کے استحکام کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں، ان قوموں کا مقصد ہی یہی تھا کہ اسلامی ملکوں پر قبضہ کے بعد وہ اسلامی معاشرہ کے تقدس کو پامال کریں، لیکن اس کوشش میں ان کو مسلمانوں سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا ہوتا تھا، مستشرقین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس مزاحمت کا اصل سبب اسلام کی تعلیمات اور پاکیزہ مذہبی روایات ہیں اور شرم و حیا، عفت و عصمت کا تصور اور جسم و روح کی پاکیزگی ہے، لیکن اس کا اعتراف مستشرقین کے لیے اپنی شکست کا اعتراف ہے اس لیے انھوں نے اسلامی معاشرہ کی اس قدر مکروہ تصویر پیش کی، اور شرم و حیا اور عفت و عصمت کی

پاکیزہ قدروں کے اعتراف کے بجائے انھوں نے فقہ کی کتابوں اور ان کے حواشی سے کچھ شاذ اور استثنائی مفروضہ صورتوں کو منتخب کیا، سوقیانہ اور غیر معیاری افسانوں کی کتابوں سے چند واقعات کو اخذ کیا۔ اور ان کی مدد سے انھوں نے اسلامی معاشرہ کے خد و خال کو داغدار کر کے پیش کیا، کیا یہی عادلانہ اور منصفانہ علمی تحقیق ہے؟

فقہ اسلامی کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ فقہا نے مسائل اور ان کے حل کی تدوین میں ایسے بہت سے مسائل اور مفروضوں کو پیش کیا ہے، جو انسانی زندگی میں حقیقۃً بہت کم پیش آتے ہیں، اصول و ضوابط کی تشکیل میں امکانی حالات کو مدنظر رکھا جاتا ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے، کہ کسی قاضی یا حاکم یا صاحب امر یا ایک عام مسلمان کو ایسی صورتوں سے واقفیت رہے جن میں قرآن و سنت کی روشنی میں حالات اور زمانہ کی رعایت اور عرف و عادت کی مصلحت کے مطابق فیصلے کیے جا سکیں، گو روزمرہ کی زندگی میں اس طرح کے مسائل اور شاذ و نادر حالات کم ہی پیش آتے ہیں تاہم انکے امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

مگر ہمارے مستشرقین مثلاً بوسکافی، میو اور چارلس وغیرہ نے چند شاذ اور مفروضہ مسائل کو دیکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہی واقعات، اسلام کی معاشرتی زندگی کی سچی تصویریں ہیں چنانچہ کسی کتاب کے حاشیہ میں جب ان کو یہ مسئلہ نظر آیا کہ، ایک ادھیڑ یا بوڑھے شخص کی شادی کسی شیرخوار بچی سے کر دی گئی، اور اس کی قانونی حیثیت پر کسی فقیہ نے اپنی کسی رائے کا اظہار کیا تو یہ مستشرقین یہ سمجھنے لگے کہ اسلام میں اس قسم کی شادی جائز اور عام طور سے رائج ہے، حالانکہ ان کو معلوم ہونا ہے کہ اسلام نے ازدواج کے لیے بلوغ کو بھی ایک شرط قرار دیا ہے، اسی طرح کسی کتاب میں نکاح متعہ کے بارہ میں رائے زنی کی گئی تو ان مستشرقین نے سارے مسلمانوں کے بارہ میں یہ رائے قائم کر لی کہ یہ لوگ تو جانوروں کی طرح اپنی خواہشات کے اسیر ہیں، اس قسم کے الزامات عائد کرنے سے

خود مستشرقین کی پست ذہنیت اور رکیک طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ ریمنڈ چارلس لکھتے ہیں کہ

"جو عورت شوہر کی زیادہ قربت و اتصال سے اذیت محسوس کرے وہ قاضی سے اوقات کی تعیین و تحدید کے لیے مدد کی طالب ہو سکتی ہے، اب اگر شوہر اس تحدید پر قناعت نہ کرے تو عورت کے لیے طلاق کا مطالبہ جائز ہو جاتا ہے۔" اس مسئلہ پر چارلس یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ "ایسے معاملات میں قاضی سے رجوع کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ مسلمان کس درجہ شہوات کے تابع ہوتے ہیں، اور اس میں وہ شرم و حیا کا بالکل لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ (ص ۲۲۹) پھر وہ لکھتے ہیں کہ "مسلمان محبت اور مباشرت میں تمیز نہیں کرتا ہے . . . . . . خالی پیٹ سے اٹھنے والی گرمی ایسے لوگوں کی طبیعت میں ابو جوش پیدا کر دیتی ہے، جو اپنی شہوانیت پر قابو نہیں رکھ پاتے، آج حالت یہ ہے کہ تمام اسلامی ملکوں میں فقر و فاقہ عام ہے۔" پھر وہ پوچھتے ہیں کہ کیا عشق و محبت کا یورپی نمونہ مسلمانوں کو ان کی بہیمیت سے نجات دلا سکتا ہے؟ (ص ۲۳۱) چارلس کی ایسی تحریروں کو دیکھ کر ناطقہ سر بگریباں ہے جن کو دیکھ کر مستشرقین کے ذہنی افلاس پر ماتم کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کی جنسی انارکی کو عشق و محبت کا مثالی نمونہ فرانسیسی مستشرق کا حسن کرشمہ ساز ہی قرار دے سکتا ہے۔

اسلام کی معاشرتی زندگی پر بحث کرتے ہوئے چارلس نے یہ بھی لکھا کہ "اسلام ایک مستبد و ظالمانہ مذہب ہے" (ص ۶۰) "اسلام کی نظر میں انسان کی کوئی قیمت نہیں"۔ اور "قرآن کی تعلیمات فلسفہ نیستیت پر مبنی ہیں"۔ "اسلام میں کبھی حرام کام بھی جائز سمجھا جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں تو وہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی قساوت قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔" (ص ۹۶) "مسلمان وحشی ہیں، قتل کرنا ان کا شیوہ ہے، ذبح کرنا ان کی عادت ہے، وہ ایذا رساں ہیں حتی کہ

دشمنوں کا گوشت کھاتے ہیں۔" (ص ۶۰)

ریمنڈ چارلس نے اپنے مطالعہ و تجزیہ میں کہیں بھی اسلامی تہذیب و ثقافت کی کسی خوبی یا امتیاز یا کسی خوبصورت مثال کا مشاہدہ نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام نے زندگی کو وجدانیات سے محروم کر دیا ہے، اس لیے ثقافت کا مسلمانوں کے معاشرہ میں گذر ہی نہیں" وہ اسلامی فلسفہ کے وجود کے منکر ہیں، اور انھیں عربی ادب کا کوئی قابل ذکر نمونہ اور امتیاز دکھائی نہیں دیتا، ان کی نظر میں یہ ادب نہایت درجہ لغو ہے وہ کہتے ہیں کہ عربی ادب میں کسی جدید اور نادر خیال کا وجود ہی نہیں ہے۔ (ص ۱۱۹) اسلام کی عدالت و سیاست کو وہ امراء و حکام کی مطلق العنانی بتاتے ہیں (ص ۱۷۱) "اسلامی جمہوریت ایک فرضی چیز ہے، کیونکہ حکومت اور قانون سازی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، وہی تنہا حاکم و کارساز ہے، حکومت اسی کی ہے وہ جسے چاہے دے (اس میں جمہور کا کیا دخل ؟)" (ص ۱۷۲) "اسلامی مساوات صرف اللہ کے سامنے صف بستہ کھڑے ہونے کا نام ہے، اس میں اور حقیقی مساوات میں فرق ہے، اسلامی مساوات سے دینی جوش ضرور پیدا ہوتا ہے، مالداروں اور غریبوں میں برادرانہ تعلقات کا وجود ہو سکتا ہے، لیکن ان تعلقات سے غریبوں کو کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا، یہ مساوات ظاہری جسمانی حدود سے آگے نہیں بڑھتی ہے، دنیا کے سارے مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس میں جمہوریت سب سے کم ہے۔" (ص ۱۷۱) مستشرقین کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ایک دوسرے کے اقوال نقل کرتے ہیں، اور اپنے ہم مشرب مستشرق کے بارہ میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اس کا مطالعہ اور اس کی رائے کی حیثیت حرف آخر کی ہے، ریمنڈ چارلس فخر کے ساتھ لیوی اسٹراس کے اقوال نقل کرتے ہیں، بدلہ میں لیوی اسٹراس اپنی کتابوں میں چارلس کی رایوں اور خیالات کو تحسین آمیز کلمات ساتھ درج کرتے ہیں۔

خود ان مستشرقین کی پست ذہنیت اور رکیک طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک جگہ ریمنڈ چارلس لکھتے ہیں کہ

"جو عورت شوہر کی زیادہ قربت واتصال سے اذیت محسوس کرے وہ قاضی سے اوقات کی تعیین وتحدید کے لیے مدد کی طالب ہو سکتی ہے، اب اگر شوہر اس تحدید پر قناعت نہ کرے تو عورت کے لیے طلاق کا مطالبہ جائز ہو جاتا ہے" اس مسئلہ پر چارلس یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ "ایسے معاملات میں قاضی سے رجوع کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ مسلمان کس درجہ شہوات کے تابع ہوتے ہیں، اور اس میں وہ شرم وحیا کا بالکل لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ (ص ۲۲۹) پھر وہ لکھتے ہیں کہ "مسلمان محبت اور مباشرت میں تمیز نہیں کرتا ہے ...... خالی پیٹ سے اٹھنے والی گرمی ایسے لوگوں کی طبیعت میں اندر جوش پیدا کر دیتی ہے، جو اپنی شہوانیت پر قابو نہیں رکھ پاتے، آج حالت یہ ہے کہ تمام اسلامی ملکوں میں فقر وفاقہ عام ہے" پھر وہ پوچھتے ہیں کہ کیا عشق ومحبت کا یورپی نمونہ مسلمانوں کو ان کی بہیمیت سے نجات دلا سکتا ہے؟ (ص ۲۴۱) چارلس کی ایسی تحریروں کو دیکھ کر ناطقہ سربگریباں ہے جن کو دیکھ کر مستشرقین کے ذہنی افلاس پر ماتم کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کی جنسی انارکی کو عشق ومحبت کا مثالی نمونہ فرانسیسی مستشرق کا حسنِ کرشمہ ساز ہی قرار دے سکتا ہے۔

اسلام کی معاشرتی زندگی پر بحث کرتے ہوئے چارلس نے یہ بھی لکھا کہ "اسلام ایک مستبد لوگوں کا مذہب ہے" (ص ۹۰) "اسلام کی نظر میں انسان کی کوئی قیمت نہیں"۔ اور "قرآن کی تعلیمات فلسفہ نیست پر مبنی ہیں"۔ "اسلام میں کبھی حرام کام بھی جائز ہو جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں تو وہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی قساوت قلبی کا اندازہ ہوتا ہے" (ص ۹۶) "مسلمان وحشی ہیں، قتل کرنا ان کا شیوہ ہے، ذبح کرنا ان کی عادت ہے، وہ ایذا رسانی میں حق کو

دشمنوں کا گوشت کھاتے ہیں" (ص ۷۰)

ریمنڈ چارلس نے اپنے مطالعہ وتجزیہ میں کہیں بھی، اسلامی تہذیب وثقافت کی کسی خوبی یا امتیاز یا کسی خوبصورت مثال کا مشاہدہ نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام نے زندگی کو وجدانیات سے محروم کر دیا ہے، اس لیے ثقافت کا مسلمانوں کے معاشرہ میں گذر ہی نہیں" "وہ اسلامی فلسفہ کے وجود کے منکر ہیں، اور انھیں عربی ادب کا کوئی قابل ذکر نمونہ اور امتیاز دکھائی نہیں دیتا، ان کی نظر میں یہ ادب نہایت درجہ لغو ہے وہ کہتے ہیں کہ عربی ادب میں کسی جدید اور نادر خیال کا وجود ہی نہیں ہے۔ (ص ۱۱۹) اسلام کی عدالت وسیاست کو وہ امراء وحکام کی مطلق العنانی بتاتے ہیں، (ص ۱۷۱) اسلامی جمہوریت ایک فرضی چیز ہے، کیونکہ حکومت اور قانون سازی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، وہی تنہا حاکم وکارساز ہے، حکومت اسی کی ہے وہ جسے چاہے دے (اس میں جمہور کا کیا دخل ہے؟) (ص ۱۷۲) اسلامی مساوات صرف اللہ کے سامنے صف بستہ کھڑے ہونے کا نام ہے، اس میں اور واقعی مساوات میں فرق ہے، اسلامی مساوات سے دینی جوش ضرور پیدا ہوتا ہے، مالداروں اور غریبوں میں برادرانہ تعلقات کا وجود ہو سکتا ہے، لیکن ان تعلقات سے غریبوں کو کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا، یہ مساوات ظاہری جسمانی حدوں سے آگے نہیں بڑھتی ہے، دنیا کے سارے مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس میں جمہوریت سب سے کم ہے" (ص ۱۱۱) مستشرقین کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ایک دوسرے کے اقوال نقل کرتے ہیں، اور اپنے ہم مشرب مستشرق کے بارہ میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اس کا مطالعہ اور اس کی رائے کی حیثیت حرف آخر کی ہے، ریمنڈ چارلس فخر کے ساتھ لیوی اسٹراس کے اقوال نقل کرتے ہیں اور یہ لیوی اسٹراس اپنی کتابوں میں چارلس کی رایوں اور خیالات کو تحسین آمیز کلمات ساتھ درج کرتے ہیں۔

رینڈ چارلس نے اپنی مذکورہ کتاب میں مسلم معاشرہ کی پستی و نکبت کے تین اہم اجزاء کی نشان دہی کی تھی، ایک تو فقہ دوسرے تعصب اور تیسرے تقدیر اور خدا کی مشیت پر مسلمانوں کا ایمان، ہم نے فقہ اور تعصب پر ان کی بعض ریوں سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ تقدیر کے متعلق رینڈ چارلس نے پہلے تو یہ تمہید باندھی کہ پس ماندگی فقر جہالت، تہذیب کی بے مائگی جیسے معاشرتی امراض کی اصل وجہ اسلام ہے، پھر انھوں نے تائید میں ایک اور مستشرق جیرالڈ ڈی برنس کے اس قول کو نقل کیا کہ "مسلمانوں کے معاشرہ کی پستی کے دو اسباب واضح ہیں ایک تو قضاء و تقدیر پر ان کا ایمان دوسرے سرمایہ داری سے مکمل اجتناب۔ ان دونوں باتوں سے ایسے نتائج سامنے آتے ہیں جو اسلام کی اقتصادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں دراصل اسلام اقتصادی روابط کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہے اسی لیے وہ اقتصادی ترقی کے فیوض سے ناآشنا ہے۔" (ص ۱۰۷)

جیرالڈ ڈی برنس کے اس قول کو پیش کرنے کے بعد رینڈ چارلس نے ایک دوسرے مستشرق رینی جنڈریم کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے جنڈریم نے الجزائر میں فرانسیسی استعمار کے وجود کو ستائش کی نظروں سے دیکھا ہے، انکا خیال ہے کہ الجزائر کے قدرتی اور معدنی وسائل سے مسلمان اپنی پست ہمتی کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ "وہ بس خدا کی مشیت پر قانع ہیں جتنا میسر ہے اسی پر صابر و شاکر ہیں جنڈریم لکھتے ہیں، کہ جب تک بندہ کی مشیت پر خدا کی مشیت غالب رہے گی، اس وقت تک انسانی معاشرہ میں ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔" (ص ۲۶۶)

فقہ، اسلامی عصبیت اور مسئلہ قضا و قدر پر ان مستشرقین کے خیالات اس قدر سطحی ہیں کہ انکی تردید کے لیے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی کہ اسلام علم و عمل کا مذہب ہے، ماضی میں اور آج کے زمانہ میں بھی اسلامی تہذیب و ثقافت، انسانی عظمت و شرف کا مثالی نمونہ ہے، پس ماندگی کی اصل وجہ اگر اسلام ہوتا تو مسیحیت، بودھ مت، ہندو دھرم اور مارکسزم کے زیر سایہ ملکوں میں کیوں پس ماندگی ہے، اسلام کے معاشرتی نظام کی بنیادیں، حریت، مساوات، اخوت، قرابت کے پاس و لحاظ اور تمام افراد کے حقوق و فرائض پر استوار ہیں، یقیناً ایسا ہی معاشرہ انسانی فوز و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے، لیکن اسلامی تعلیمات اور اسلام کے مزاج کو سمجھے بغیر اسلامی معاشرہ کے تجزیہ کی کوشش کی جائیگی تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو ان مستشرقین کی کتابوں میں نظر آیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اور علامہ اقبال

از

پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ جموں یونیورسٹی، جموں

جب دہلی اردو اکادمی کی طرف سے مجھے یہ دعوت ملی کہ مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین اور علامہ محمد اقبال کے موضوع پر مقالہ پڑھنا ہے، تو میں نے اس کا ذکر برسبیل تذکرہ اپنے دو ایک دوستوں سے کیا۔ ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ اس موضوع پر کیا لکھا جا سکتا ہے، دونوں میں قدر مشترک تو کوئی تھی ہی نہیں، سیاسیات میں دونوں کے رستے الگ الگ تھے۔ اس پر مجھے اپنے ان نئے پرانے مقالات کا خیال آیا جن کا موضوع اقبال اور دوسرے اہل قلم کا تقابلی مطالعہ تھا، مثلاً اقبال اور کانٹ، اقبال اور فختے، اقبال اور شوپن ہار، اقبال اور کارل مارکس، اقبال اور نیٹشے یا اقبال اور برگساں وغیرہ، اور میرے سامنے یہ بات آئی کہ اقبال نے سو فی صد اتفاق تو ان میں سے کسی فلسفی سے نہیں کیا، خلیفہ عبدالحکیم کے یہ کہنے کے باوجود کہ اقبال نے فلاں خیال نیٹشے سے لیا ہے، اور فلاں بات نیٹشے سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا نیٹشے سے ذہنی بعد بہت زیادہ ہے، اور ذہنی قرب بہت کم۔ اور تو اور اقبال نے سو فی صد تو اپنے پیر و مرشد مولانا روم کو بھی قبول نہیں کیا۔ نہ ہی رومی جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرار جاں من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

ان ہی سے اقبال کا اختلاف اس "نے" سے متعلق آخر تک برقرار رہتا ہے۔ جو مثنوی مولانا روم میں انجام کار نیستاں کا جز بن جاتی ہے،

اس کے بعد میں نے اپنے اور مقالات پر غور کیا۔ جن میں اس طرح کا تقابلی مطالعہ نہیں تھا۔ مثلاً "اقبال اور پریم چند یا اقبال اور حسرت موہانی" تو ان میں بھی جو نکتہ میرے سامنے آیا وہ یہ تھا۔ کہ پریم چند کے متعلق اقبال نے ایک نہایت خوبصورت چھوٹی سی تحریر سپرد قلم کی تھی۔ اور حسرت موہانی کا ذکر اپنے اس مضمون میں کیا تھا۔ جو انھوں نے تنقید ہمدرد کے جواب میں لکھا تھا۔ لیکن ان دونوں مقالوں کی تعمیر انہی دو نکتوں پر تو نہیں اٹھائی گئی تھی۔ اور پھر میرا ایک مقالہ اقبال اور جوش کے عنوان سے بھی ہے۔ اقبال نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام جوش کو سفارشی خط دیا تھا۔ اور جوش صاحب کی علامہ اقبال سے دو ایک ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں، لیکن مقالے میں ان دونوں باتوں کا ذکر تو ایک جملۂ معترضہ کے طور ہی پر آیا تھا۔ اصل بات جو ان تمام مقالات میں جاری وساری تھی یہ تھی کہ ایک ہی وقت میں یا ایک ہی طرح کی علمی، سیاسی، سماجی یا فلسفیانہ فضا میں جب دو بڑے فن کار اور بڑے اہل قلم زندگی بسر کرتے ہیں، تو وہ ایک دوسرے سے بظاہر متاثر ہوں یا نہ ہوں ماحول کا رشتہ دونوں کے افکار میں خاصی حد تک ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے، اور اس کا ان کی تحریروں میں اظہار ہو یا نہ ہو، وہ ہم آہنگی دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے تعلق سے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے میں ایک بات اور کہنا چاہونگا اور وہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے باہمی تعلق خاطر کے متعلق، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں سنہ ۱۹۰۴ء میں دونوں حضرات انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک تھے، اگر اسے ملاقات کہا جا سکتا ہے

تو صرف یہی ملاقات ان دونوں کے درمیان ہوئی ہے۔ لیکن اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کہ دونوں کی آپس میں کوئی بات چیت ہوئی یا نہیں، یہ وہی جلسہ ہے، جس میں خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے، اور انھوں نے یہ کہہ کر کہ "تمھارے جام مے کی نذر میری پارسائی ہو،" اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا تھا۔ غالباً خط وکتابت بھی ان دونوں عظیم ہستیوں کے درمیان نہیں ہوئی۔ لیکن مولانا ابوالکلام کے بارے میں اقبال کے ایسے تاثرات جا بجا ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں مولانا کے لیے احترام اور محبت کا جذبہ موجود تھا مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں مولانا کی رہائی پر اقبال لکھتے ہیں۔ "الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی"۔ اسی خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتا لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں جب "رموز بے خودی" شائع ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تعریف میں علامہ اقبال کو خط لکھا۔ اس وقت یہ خط تو نایاب ہے، اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اقبال کسی کا خط سنبھال کے رکھنے کے عادی نہیں تھے، غالباً وہ خط کا جواب دے کر اسے ضائع کر دیتے تھے، لیکن اقبال کا خط اس سلسلے میں موجود ہے بنام سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام جس میں وہ لکھتے ہیں۔ "آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو پسند فرمایا ہے۔ اور علامہ کے انتقال پر تو مولانا نے یہ لکھا تھا کہ مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات تھے، اب یہ تعلقات کہیں خطوں کی صورت میں یا مقالات کی صورت میں موجود ہوں یا نہ ہوں، یہ بات اتنی اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں نے جو بڑے بڑے کام کیے۔ ان میں ایک کام یہ ہے کہ دونوں نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اقبال کی وہ کتاب اس موضوع پر شائع ہوئی۔ "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے عنوان سے اور مولانا کی

اگرچہ کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خاصا حصہ بلکہ بیشتر حصہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یعنی The Reconstruceion of Religious Thought in Islam ہی کے ذیل میں آتا ہے، اور اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔ کہ سیاسیات میں دونوں کے رستے الگ تھے۔

یہی بات مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین اور علامہ اقبال کی فکری ہم آہنگی کے بارے میں کہنا ہے۔ یعنی یہ کہ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں ہے کہ سیاسیات میں ہمارے ملک کے ان دو عظیم دانشوروں کے رستے الگ الگ تھے۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ دونوں میں فکری ہم آہنگی کتنی زیادہ تھی، ہندوستان میں مسلم لیگ کی تشکیل سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی نوعیت کے اختلافات اس سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے، یہ اختلافات ملک کی اجتماعی زندگی میں رخنہ پیدا کر کے اکثر اپنی صورت دکھا جاتے تھے۔ ہاں تحریک خلافت کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا، اور بہت مختصر زمانہ جب کہ یہ اختلافات قریب قریب ختم ہو گئے تھے، یہ سنہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے، اسوقت ملک کی سیاست میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا طوطی بولتا تھا۔ یہ دونوں سیاسی رہنما مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے، چنانچہ دونوں نے ترک موالات کے دنوں میں برطانوی حکومت کے بائیکاٹ کی پالیسی اختیار کی۔ گاندھی جی اس زمانے میں علی گڑھ تشریف لے گئے، اور اس امر کی انھوں نے بہت کوشش کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کرے۔ لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی، اور نتیجتاً ان کے حامیوں نے علی گڑھ کو چھوڑ کر اپنی الگ یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ یونیورسٹی آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ علی گڑھ سے علٰحدگی اختیار کرنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے۔ اور غالباً

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ علامہ اقبال علی گڑھ کو چھوڑنے والوں کے ہم خیال نہیں تھے۔ اگرچہ اس وقت یعنی اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر نہیں تھے۔ وائس چانسلر وہ اگلے برس مقرر ہوئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ روز اول سے جامعہ ملیہ کے روح رواں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے اقبال کو خط لکھا۔ اور انھیں جامعہ کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی تو انھوں نے اس ضمن میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ ہی ساتھ ذاکر صاحب سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔

اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو عظیم شخصیتیں سیاسیات میں ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے کمالات کی کس قدر معترف ہوتی ہیں۔ اور تہذیبی دھارے کو اپنے فکر و نظر کی بدولت کس طرح رواں دواں رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

علامہ اقبال جامعہ کے وائس چانسلر بن کر تو نہ آئے لیکن جامعہ کے ساتھ انھیں جو ایک تعلق خاطر رہا وہ آج ہماری تاریخ ادب کا اہم حصہ ہے۔

(۲)

ذاکر صاحب علامہ اقبال سے بیس برس چھوٹے تھے۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۷۷ء ہے اور ذاکر صاحب کی سنہ ۱۸۹۷ء۔ گویا یہ ایک خوردی اور بزرگی کا رشتہ تھا۔ ذاکر صاحب جب بیس برس کے ہوں گے تو اس وقت اقبال کی تین چار تصانیف ان کی نظر سے گذر چکی ہوں گی۔ علم الاقتصاد (The Development of melaphysics impersisa) اسرار خودی اور رموز بے خودی اور ان کی بعض معرکہ آرا نظمیں اور غزلیں بھی۔ اور سنہ ۱۹۲۱ء میں خضر راہ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں طلوع اسلام بھی شائع ہو گئی تھی۔ دو برس بعد

بانگِ درا چھپ گئی، لیکن کلیاتِ اقبال اس سے بہت پہلے چھپ چکی تھی، اور وہ بھی حیدر آباد میں؛
یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جن بانیوں نے اس خواہش کا اظہار
کیا تھا کہ علامہ اقبال کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا وائس چانسلر بنایا جائے اور اس مقصد
کے لیے انھوں نے مہاتما گاندھی سے اقبال کے نام خط لکھوایا تھا۔ اور جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی
شامل تھے، صرف یہی نہیں کہ علامہ کی سحر انگیں شاعری کے غلغلے سے متاثر تھے۔ بلکہ ان کے
افکار، علمی کمالات اور سیاسی نظریے سے بھی پوری طرح باخبر تھے، یہ جامعہ ملیہ کی خوش نصیبی
ہے، کہ ذاکر صاحب کو جامعہ میں رفقائے کار بھی ایسے ملے جو سرتاپا علمی لگن میں ڈوبے رہے، اور
زندگی بھر جامعہ کی بے لوث خدمت کرتے رہے، یہاں چونکہ بات علامہ اقبال کی ہو رہی ہے۔
مجھے اس وقت ذاکر صاحب کے ساتھ ہی مجیب صاحب اور عابد صاحب کا خیال آ رہا ہے۔
۳۰ء کی بات ہے۔ جامعہ میں جشنِ اقبال منانے کی بات چیت چلی، اس ضمن میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں۔

"عابد صاحب اور ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ جرمن یونیورسٹیوں کی طرح جامعہ
بھی جشنِ اقبال کے نام سے ایک تقریب منائے جس میں ہندوستان کے اکابر اہلِ علم
اور ممتاز شخصیتیں شریک ہوں۔ اور حضرتِ علامہ کی خدمت میں جو خود بھی رونق افزائے
بزم ہوں گے، متعدد علمی اور فلسفیانہ مقالات کا ایک کشکول بطور اظہار عقیدت
پیش کیا جائے، لیکن افسوس ہے، بعد کے حالات سیاسی ہنگاموں، تحریک قانون شکنی، راؤنڈ ٹیبل
کانفرنس، کے اعلان وغیرہ کے باعث یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔"[1]

سید نذیر نیازی وہ قابلِ قدر شخصیت ہیں، جنھوں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم پائی، ڈاکٹر ذاکر حسین
پروفیسر مجیب اور ذاکر عابد حسین کے شاگرد رہے، علامہ اقبال کے نیاز مندوں میں تھے۔

[1] مکتوباتِ اقبال (سید نذیر نیازی)، اقبال اکیڈمی کراچی ستمبر ۵۷ء۔ صفحہ ۴

بلکہ ان کا تعارف یوں ہونا چاہیے کہ وہ مولوی سید میر حسن کے بھتیجے تھے۔ اور علامہ کی تصنیف
The Reconstruction of Religious Thought in Islam۔ کا انھوں نے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔
انھوں نے اپنی کتاب مکتوبات اقبال میں کئی جگہوں پر یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال
کی صحت کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔

اسی کتاب مکتوباتِ اقبال میں غازی رؤف پاشا کی جامعہ ملیہ میں آمد کا ذکر کرتے
ہوئے۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں "ڈاکٹر انصاری مرحوم کے حضرت علامہ سے ذاتی تعلقات
تھے، انھوں نے اگرچہ اپنی طرف سے بھی حضرت علامہ کو تشریف آوری کی دعوت دے رکھی تھی اور
بحیثیت شیخ الجامعہ ذاکر صاحب بھی ایک خط لکھ چکے تھے۔ مگر پھر اس کے ساتھ ذاکر صاحب
نے مجھ سے فرمایا کہ میں بھی ایک خط اپنی طرف سے لکھ دوں بلکہ کوشش کر دوں کہ حضرت علامہ جامعہ
کی درخواست قبول کر لیں، چنانچہ میرا عریضہ حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچا تو ارشاد ہوا۔

ڈیر نیازی صاحب　السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اگر تبدیلی ناممکن ہے، تو بڑی مشکل ہوگی آپ کوشش کریں کہ آخری
لیکچر کا روز میری صدارت کے لیے ہو، اور آخری لیکچر ۱۸ کو ہو۔ اگر ناممکن ہو تو میں ۱۹
مارچ کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۰ کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا لیکن اگر ڈاکٹر انصاری
یہ مان جائیں کہ آخری لیکچر ۱۸ کو ہو تو مجھے تار دے دیجیے۔ باقی خیریت ہے۔ ۲۰ مارچ
کی صبح (یا جیسی صورت حال ہو) آپ مجھے اسٹیشن پر ملیں۔

والسلام

محمد اقبال۔ لاہور

۸ مارچ ۱۹۳۳ء

میں نے حضرت علامہ کا ارشاد حرف بحرف ذاکر صاحب کو پہنچا دیا۔ ذاکر صاحب بہت خوش تھے، مگر اب مشکل یہ تھی کہ اس طرح مرتب کردہ بلکہ اعلان شدہ پروگرام میں کچھ خلل سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بالآخر باہمی مشورے کے بعد طے پایا کہ حضرت علامہ سے ۱۰ مارچ کو تشریف آوری کی درخواست کی جائے۔ اور حضرت علامہ نے بھی یہ درخواست منظور کر لی۔ اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی طرف سے تو شکریے کا خط لکھ ہی چکے تھے۔ لیکن ۹ مارچ کی شام کو حکم ہوا۔ اور ذاکر صاحب نے بھی اصرار کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں اور ۱۰ مارچ کی صبح کو حضرت علامہ کو ساتھ لیے واپس آجاؤں، لہٰذا ۱۰ مارچ کی صبح کو میں لاہور پہنچا۔ حضرت علامہ ایک طرح سے منتظر ہی تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اول ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی موصوف کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔ پھر احباب جامعہ بالخصوص ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کا حال پوچھا باتوں باتوں میں ترکوں اور ترکی کی سیاست کا ذکر آگیا۔[1]

اس طرح اس کتاب میں ذاکر صاحب اور علامہ اقبال کے تعلق خاطر کا ذکر کئی موقعوں پر آیا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوششوں کی بدولت علامہ اقبال ۱۰ مارچ کی صبح کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لے آئے۔ اسی شام کو انھوں نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی جس میں غازی رءوف پاشا نے وطنیت اور اتحاد اسلامی کے موضوع پر توسیعی خطبہ ارشاد فرمایا اقبال یوں تو جامعہ کے مہمان تھے، لیکن ان کا قیام ڈاکٹر انصاری کے دولت کدے پر رہا۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی، مذکورہ جلسے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غازی موصوف نے خطبہ پڑھا، اور محمد اقبال بحیثیت صدر اختتامی کلمات

---

[1] مکتوبات اقبال (سید نذیر نیازی)، اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء ص ۹۵-۹۶

کہنے کے لیے آئے تو غازی موصوف کے خیالات کی رعایت سے اسلام کے مستقبل کا خیال آگیا۔ بے قابو ہو گئے۔ جذبات کا زور تھا۔ تقریر کرتے چلے گئے۔ تا آنکہ مسجد قرطبہ کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے اور جو بہت آگے چل کر بالِ جبریل میں شائع ہوئی، اس کے اس شعر

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

سے ابتدا کرتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا شعر پڑھنے لگے تو پھر کیا تھا، سامعین وجد میں آگئے، مجمع ہمہ تن گوش، محو علی ہال کے گوشے گوشے میں خاموشی ہی خاموشی، ایک تو ان کا تازہ کلام، دوسرے غازی حسین رءوف پاشا کی محبوب شخصیت، خلافت عثمانیہ کی مجاہدانہ سرفروشیوں کی زندہ یادگار، ہر کوئی سوچ رہا تھا ہم کیا تھے۔ کیا ہو گئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ کہہ کر

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

تقریر ختم کی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو طلسم خاموشی ٹوٹا۔ شرکائے جلسہ آگے بڑھ بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔"[1]

دراصل یہ سارا کرشمہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ دور اندیشی سے کام لے کر اقبال کو اپنے ہمراہ دہلی لے آنے کے لیے سید نذیر نیازی کو لاہور نہ بھیجتے تو علامہ اقبال کا ۱۰ مارچ کی صبح تک دہلی پہنچ جانا غالباً ممکن نہ ہوتا۔

(۳)

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے۔ ذاکر صاحب نے علامہ اقبال کے بارے میں

---

[1] مکتوبات اقبال۔ ص ۹۹-۱۰۰۔

کوئی مضمون نہیں لکھا۔ لیکن فکر اقبال اور کلام اقبال سے ان کا تعلق خاطر اس پیغام میں نظر آتا ہے۔
جو انھوں نے جوہر کے اقبال نمبر کے لیے مدیر جوہر کو بھیجا۔ اس میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں،

"آپ جس شخص کی یاد میں یہ پرچہ نکال رہے ہیں، اس کا کلام ایسا جامع پیام ہے کہ اگر
ہمارے نوجوان اسے سمجھ لیں تو شاید ہماری ملّت کے دن پھر جائیں۔ . . . . . .
خود اقبال کا ظہور ہماری ملی زندگی میں ایسا واقعہ ہے، جس سے ڈھارس بندھتی ہے
کہ اب رت بدلنے کو ہے، . . . . اقبال ان شاعروں میں سے نہ تھے جو زندگی
سے بس لطف اٹھاتے اور اس کا گیت گاتے ہیں۔ وہ ان مسیحا نفسوں میں سے تھے،
جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔"

اس دو تین صفحے کے پیغام میں جس بات نے راقم التحریر کو متاثر کیا ہے وہ یہ ہے۔ کہ
اس میں اقبال کی شاعری اور فکر دونوں کی طرف ذاکر صاحب نے بلیغ اشارے کیے ہیں، ان کی
فارسی شاعری کا ذکر بھی آگیا ہے، جذبہ کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی مقصدیت کا بھی، خودی کا بھی،
عقل و عشق کا بھی، وجدان کا بھی اور عقل کے ادب خوردۂ دل ہونے کا بھی، نور حیات کا بھی
اور نار حیات کا بھی اور ظاہر ہے کہ اشاروں ہی اشاروں میں ان تمام
امور کی عقدہ کشائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اقبال کی تمام تصانیف میں قاری
ڈوب نہ چکا ہو۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بقول سید نذیر نیازی
"۱۹۲۳ء میں جب ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی تشریف لے گئے۔ اور دوران
قیام میں مطبع کاویانی برلن سے دیوان غالب کا ایک منقش اور مطلا نسخہ شائع کیا۔ تو بسبب
اس عقیدت کے جو انھیں حضرت علامہ سے تھی، مجھے لکھا، "جی چاہتا ہے، بانگ درا کی طباعت بھی

اسی اہتمام سے مطبع کاویانی ہی میں کی جائے"۔ لیکن حضرت علامہ کو یہ تجویز پسند نہیں آئی کیونکہ
برلین میں نستعلیق طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور حضرت علامہ نستعلیق کو کسی طرح بھی
نسخ پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عکسی طباعت البتہ ممکن تھی مگر اس کے مصارف
بے حد زیادہ تھے۔ لہٰذا یہ تجویز رہ گئی"۔[1]

(۳)

ذاکر صاحب مرحوم سے راقم التحریر کی بہت کم ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار تو اس وقت
جب وہ میری بیٹی کی شادی پر ہمارے گھر تشریف لائے تھے، نئی دہلی میں اس وقت ان کی زیادہ
تر باتیں والد محترم سے ہوئیں۔ ایک ملاقات میں اپنی کتاب 'اقبال اور اس کا عہد' کا
پہلا ہندوستانی ایڈیشن میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت اس کتاب کی وجہ سے
بات چیت کا موضوع علامہ اقبال ہی رہا۔ اس میں انھوں نے ایک جملہ یہ بھی کہا تھا کہ
آپ لاہور والوں نے اقبال کو monopolise کر لیا ہے، اس جملے کے کئی معنی نکل
سکتے تھے، اس لیے میں نے جواب میں اتنا ہی کہا کہ اقبال تو مشرق و مغرب کا شاعر ہے کوئی
ایک شہر اسے کیسے monopolise کر سکتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کتاب کے
ابواب پر نظر ڈالی اور ایک باب "کلام اقبال کا ہندوستانی پس منظر" تھوڑی دیر تک
دیکھتے رہے۔ اور مجھ سے کہا کہ اس موضوع پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ اس کا دوسری زبانوں میں
ترجمہ ہونا چاہیے اور اس طرح کی اور مثالیں بھی اگر کلام اقبال سے ملیں تو انھیں بھی اس
باب میں شامل کرنا چاہیے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی شاعری کے
یہ پہلو زیادہ تفصیل کے ساتھ اہل ملک کے سامنے آئے۔ میں نے عرض کیا کہ اقبال کی شاعری

---

[1] مکتوبات اقبال (سید نذیر نیازی) صفحہ ۴

اس پہلو کو بعض حدود کے اندر ہی دیکھا جاسکتا ہے، اس پر زیادہ زور اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ ہم اہل ہند اس وقت حب الوطنی اور نیشنلزم کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں، اقبال کے یہاں حب الوطنی تو ملتی ہے۔ لیکن وہ نیشنلزم کے مخالف ہیں۔ اور اگر زیادہ تفصیل سے لکھا جائے تو ہمیں حب الوطنی اور نیشنلزم میں ایک حد فاصل کھینچنا ہوگی۔ ورنہ پھر اس کا امکان ہے کہ بات میں خلط مبحث پیدا ہو جائے۔ انھوں نے اس پر سوال کیا کہ خلط مبحث کے پیدا ہونے کا کیوں امکان ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہمارے بعض اہل قلم اقبال کی حب الوطنی کے حدود کو اتنی دور کھینچ کے لے جاتے ہیں کہ وہ اقبال کو اس تصور پاکستان سے لاتعلق کر دیتے ہیں جو ان کے سن ۱۹۳۰ء والے خطبہ صدارت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا۔ اب میں نے یہ جواب دیا کہ بعض حضرات اقبال کو تصور پاکستان سے لاتعلق ثابت کرنے کے لیے اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ اقبال کے مذکورہ خطبے میں یا ان کی ساری شاعری میں پاکستان کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ تو ان کی اس دلیل کے پیش نظر میں یوں کہوں گا کہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں یقیناً وہ تصور پیش کیا۔ جو آگے چل کے تشکیل پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس پر ذاکر صاحب نے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور نہ جانے کیسے لیکن بات چیت کا رخ نیشنلزم اور نیشنلزم کے مغربی تصور کی طرف ہوگیا۔ اور میں علامہ اقبال کے متعلق ان کے خیالات ان کی زبانی سننے سے محروم رہ گیا۔

(۵)

مذکورہ بالا پیراگراف کو آپ جملۂ معترضہ ہی سمجھیے۔ میں نے اس میں صرف بیان واقعہ سے کام لیا ہے۔ کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے قبل بات فکری ہم آہنگی کی ہو رہی تھی،

یہ فکری ہم آہنگی ہمیں علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں زندگی کے اس شعبے میں نظر آتی ہو جسے ہم تعلیم کا شعبہ کہتے ہیں۔ دراصل علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین بنیادی طور پر سیاسی آدمی نہیں تھے، اگرچہ ذاکر صاحب ہندوستان کے نائب صدر اور صدر کے عہدے تک پہنچے اور اقبال پنجاب مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے، پنجاب لیجلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ الکشن لڑنے کے بعد لیکن مزاجاً دونوں سیاسی آدمی نہیں تھے، تعلیم اور تعلم کے مسائل سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ اگرچہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں زیادہ لکھا نہیں گیا۔ لیکن انھوں نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل سے دونوں غافل نہیں رہے۔ بچوں کی تعلیم کو بھی دونوں نے نظر میں رکھا ہے، اور چونکہ دونوں ایجوکیشنسٹ (Educationist) بھی تھے، اور ایجوکیٹر (Education) بھی اس لیے انھوں نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ اس کے تمام علمی پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد لکھا ہے۔

بچوں کی تربیت کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے تین تقریریں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیں۔ تیسری تقریر میں کہتے ہیں۔

"ظاہری ڈسپلن کے بھوت کے بعد مدرسوں کا رائج نصاب بھی بچوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہونے دیتا۔ آدمی کی تاریخ پر نظر ڈالیے اسکی بڑی بڑی محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ یہ جن چیزوں کو پہلے کسی کام کا ذریعہ بناتا ہے۔ ہوتے ہوتے خود اسی ذریعہ کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ وسیلہ قریب ہوتا ہے اور مقصد دور، بس وسیلہ ہی نظر میں رہ جاتا ہے۔ مقصد اوجھل ہو جاتا ہے۔"

یہ وہ اہم نکتہ ہے۔ جس پر اقبال نے اپنی نظم اور نثر دونوں میں اپنے خیالات کا جابجا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

آگہی از علم و فن مقصود نیست　　غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

گویا تعلیم کا مقصد صرف "معلومات" فراہم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ذریعے ان صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں۔ اقبال کے ایک مضمون کا عنوان ہے "بچوں کی تعلیم و تربیت" جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"جس طرح جسمانی اعضا، تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں اسی طرح نفس ناطقہ کی نشو و نما بھی ان ہی اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔ لہٰذا طریق تعلیم کامل وہی ہوگا۔ جو نفس ناطقہ کے تمام قواعد کے لیے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے اور ادراک، تخیل، تاثیر، مشیت، غرض کہ نفسِ ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہئے کیونکہ کامل طریقہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں، نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔"

جہاں تک تعلیمی مسائل پر بات چیت کا تعلق ہے، ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں معلم بھی تھے اور مفکر تعلیم بھی، اس لیے بچوں کی تعلیم سے لے کر بڑوں کی تعلیم تک کے تمام مسائل پر انھوں نے نظر ڈالی ہے اور ان مسائل کے اکثر پہلوؤں پر دونوں کے افکار میں ایک حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے مثلاً علوم جدیدہ کے بنیادی اصول، علوم جدیدہ کے حصول کی ترغیب و تحریص، تعلیم جدید کی خرابیاں اور ان میں اصلاح کے طریقے، مقاصد تعلیم، علوم طبعی، علوم عمرانی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی اگر مثالیں تلاش کی جائیں تو دونوں کی تحریروں میں قدم قدم پر ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ابھی ہم نے بچوں کی تعلیم کے متعلق ان دونوں مفکرین تعلیم کے خیالات کا ذکر کیا ہے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس ضمن میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام مصروفیات

میں سے وقت نکال کر بچوں کے لیے ادبی لٹریچر مہیا کیا، اقبال نے شعر میں اور ذاکر صاحب نے نثر میں۔ ذاکر صاحب کی کتاب ابو خان کی بکری اور اقبال کی نظمیں

"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"

یا "ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا"

یا　"اک دن کسی مکھی سے کہنے لگا مکڑا"

کو بچے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اگرچہ بچوں کے لیے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے زیادہ نہیں لکھا لیکن جتنا بھی لکھا ہے اس کی حیثیت روشنی کے اس مینار کی ہے جو راہ چلتے مسافر کو رستہ دکھاتا رہتا ہے۔

(۶)

ایک اور قدر مشترک جو ان دونوں نابغوں کے افکار میں نظر آتی ہے، وہ ہے فلسفہ کے ساتھ ایک گہرا تعلق خاطر۔ اقبال نے تو خیر ایک فلسفی کے طور پر بڑا نام پایا، ڈاکٹر ذاکر حسین کے فلسفیانہ مزاج کو جانچنے کے لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ ان کے تعلیمی خطبات یا افلاطون کی کتاب ریاست کا اردو ترجمہ اول سے آخر تک پڑھیے بلکہ اتنا ہی کہوں گا کہ ایک نظر اردو ترجمے کے اس مختصر سے مقدمے پر ڈال لیجئے، میری بات کی وضاحت ہو جائے گی آخر ذاکر صاحب نے ترجمے کے لیے اس عظیم کتاب کا انتخاب کیوں کیا۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ افلاطون نے ریاست میں نظام تعلیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ آج ڈھائی ہزار برس گذر جانے کے بعد بھی پرانا نہیں ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر فلسفے سے ذاکر صاحب کو دلی رغبت نہ ہوتی اور افلاطون کے نظریات پر ان کی گہری نظر نہ ہوتی تو ضروری نہیں کہ وہ اسی کتاب کا انتخاب کرتے۔ ترجمے کے لیے وہ تعلیم کے موضوع پر

کسی اور جدید کتاب کو بھی منتخب کر سکتے تھے ۔ میں اس بات کو علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں کسی قدر مشترک کی موجودگی پر محمول کروں یا نہ کروں. لیکن ریاست اور اس کا مقدمہ پڑھتے وقت بارہا مجھے خیال آیا کہ اقبال نے بھی افلاطون کا مطالعہ فکر کی پوری گہرائی کے ساتھ کیا ہے اور ان کی Reconstruction of Religious. Thought in Islam. میں افلاطون کا ذکر کئی جگہوں پر آیا ہے۔ اب آپ ممکن ہے یہ کہیں کہ اقبال نے تو افلاطون کے مسلک کو مسلکِ گوسفندی کہا ہے، اور اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم	از گروہ گوسفندانِ قدیم
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم	در کہستانِ وجود افگندہ سم
آنچناں افسونِ نامحسوس خورد	اعتبار از دست و چشم و گوش برد
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت	خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

تو یہاں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، کہ اقبال کے یہ سارے اعتراضات افلاطون کے صرف ایک نظریے ۔ نظریہ اعیان (The Ideas) پر ہیں اس کے سارے فلسفے اور سارے علم و فضل پر نہیں ہیں، اقبال افلاطون کی فلسفیانہ عظمت کے قائل ہیں، اور ان کے اکثر فلسفیانہ افکار کی انھوں نے تائید کی ہے۔ "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں وہ ان چند الفاظ میں افلاطون کو قابلِ ذکر خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں ۔

"چنانچہ قرآن، مذہب، ریاست، اخلاقیات اور سیاست میں اسی طرح ایک باہمی ربط بہت ضروری خیال کرتا ہے، جس طرح افلاطون نے اپنی تصنیف "ریاست" میں بیان کیا ہے۔"

اسی طرح اقبال کا یہ شعر بھی صرف عورت ہی کے احترام میں نہیں ہے، بلکہ اس میں افلاطون کو بھی خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن	اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اور مذکورہ کتاب "ریاست" کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین رقم طراز ہیں ۔

"سچ یہ ہے کہ اس (کتاب) میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفے کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین حیز میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے۔ تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو لو روسو "فنِ تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ سب سے بہتر ہے"۔ سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئتِ اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے، اور انسانی جماعتوں کے تغیر و عروج و زوال کے اسرارِ سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں پانی کر دیے گئے ہیں۔"

تو حضرات، اپنی اس مختصر سی تحریر میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش میں نے نہیں کی کہ سیاست میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے رستے الگ الگ تھے ۔ وہ تو خیر تھے ہی. لیکن سیاست کی اقدار سے زندگی کی اقدار کہیں بلند ہیں۔ اور اگر زندگی کی اقدار پیشِ نظر ہوں تو نگاہ ہمیشہ ایک دوسرے کے

محاسن پر جاتی ہے۔ اقدار مشترک پر جاتی ہے۔ اختلافات پر نہیں جاتی، اور اس وقت انسان کا اپنا کھراپن ہی اس کی پرکھ کا پیمانہ بنتا ہے۔ دراصل اقبال اور ذاکر حسین دونوں درویش صفت انسان تھے، اور اگر اپنی اس تحریر کو میں اقبال کے ان دو اشعار پر ختم کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستا خیز
جو ذکر کی گرمی میں شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

اقبال کامل

اس وقت تک تو اردو میں علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان اور پاکستان میں اتنی کتابیں لکھی جاچکی ہیں کہ صرف انہی کتابوں سے ایک پوری لائبریری قائم ہوسکتی ہے، مگر یہ کتاب جس وقت لکھی گئی تھی سوائے یوسف حسین خاں صاحب کی روح اقبال کے کوئی کتاب موجود نہیں تھی، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعات یعنی فلسفہ خودی فلسفہ بیخودی نظریۂ ملیت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام تعلیم وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

مرتبہ۔ مولانا عبدالسلام ندوی

قیمت: ۲۰ روپیے

تصوّف اور ترکِ دنیا[1]

از

جناب سید وحید اشرف صاحب مدراس یونیورسٹی۔

اسلام دین فطرت ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کے عقائد، اصول اور اعمال انسانی فطرت کے مخالف نہیں ہیں، اور جو چیز فطرت کے خلاف نہ ہوگی وہ عقل کے خلاف بھی نہ ہوگی، مثلاً نکاح کرنا، تجارت و حرفت میں مشغولیت، کھانا، پینا اور سماجی و سیاسی زندگی میں شریک ہونا، یہ تمام باتیں انسانی فطرت کے تقاضے ہیں، اسلام ان امور میں ہمیں جائز اور ناجائز طریقوں سے آگاہ کرتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ آدمی مجرد رہ کر جنگل میں جاکر پوجا پاٹ میں زندگی بسر کردے، دین فطرت کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اسلام کی تعلیمات پر عمل کرکے ہدایت پاسکتا ہے، اور خدا کی رضا حاصل کرسکتا ہے، جب کہ فیثاغورثی فلسفہ اور ہندوستان کے اکثر مذاہب میں ایسا نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک وہی انسان نجات پاسکتا ہے جو ایک خاص روحانی بلندی تک پہونچ چکا ہو، جہاں تک پہونچنے کے لیے علائق دنیوی سے کنارہ کشی کرنا پڑتی ہے، اگر وہ اس خاص معیار تک اپنی زندگی میں نہ پہونچ سکا تو مرنے کے بعد اس کو دوسرا جنم دیا جائے گا، تاکہ وہ اپنی روحانیت کی تکمیل کرسکے، اور اس وقت تک بار بار

---

[1] یہ مقالہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کے سالانہ عرس کے موقع پر منعقدہ ۵ر اگست ۱۹۸۵ء کو پڑھا گیا، اور اب کچھ اضافہ کے ساتھ معارف میں شایع کیا جارہا ہے۔

جنم لیتا رہے گا، جب تک وہ اپنی روحانیت کی تکمیل نہ کر لے، بدھ مذہب کے مطابق انسان کا عمل کسی بھی شکل میں جنم لے سکتا ہے، مثلاً مچھر، مکھی، کتا، بلی، پتھر یا انسان وغیرہ، لیکن بعض دوسرے مذاہب میں انسان اپنے آیندہ جنم میں بھی انسان ہی رہتا ہے، اس کے برعکس اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ جس کو خدا نے جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق احکام الٰہی کی پیروی کرے (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) یہی اس کی نجات کا ضامن ہے، کیونکہ جس کو خدا نے صلاحیت ہی نہ دی اس کے لیے عمل کا بلند ترین روحانی معیار مقرر کرنا فطرت کے خلاف ہے، اس لیے شریعت نے کم سے کم معیار مقرر کر دیا ہے، جس پر ہر شخص عمل کر سکتا ہے، توحید پر ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حقوق العباد اور برائیوں سے اجتناب، یہ وہ اعمال ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہیں، مالی عبادات میں صاحب نصاب ہونا اور استطاعت رکھنا شرط قرار دیا گیا ہے۔ رسالت اور آخرت اور اس کی جزئیات پر ایمان عقیدۂ توحید ہی کے تابع ہے، اور حالات کے مطابق بعض اعمال میں نرمی بھی کی گئی ہے لیکن ایسا بھی ہے کہ بہت سے لوگ عقل وفہم میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن میں تدبر سے کام لیں، اس کے بعد ان کا ایمان زیادہ مدلل اور مستحکم ہوگا، بعض اشخاص ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کے اس دعوے کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہیں کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جس کا تمہیں وہم وگمان نہ ہو[1]، اور کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو یہ دیکھنا چاہیں گے کہ خدا ان کے لیے کس طرح کافی ہو جاتا ہے جو اپنے کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دیتے ہیں[2]۔

[1] سورۂ طلاق: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

[2] سورۂ طلاق: وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں تمام لوگوں کے لیے اسلام نے نجات کے لیے کم سے کم ایک معیار مقرر کر دیا ہے وہاں روحانی ترقی کی راہیں بھی کھول دی ہیں، تاکہ جو لوگ صاحب استعداد، باہمت اور بلند حوصلہ ہوں، اور روحانی ترقی کی تڑپ رکھتے ہوں، جو عقل کو مطمئن کرنے اور روح کی پیاس بجھانے کے لیے بے قرار ہوں، وہ اعلیٰ روحانی مدارج حاصل کر سکیں، اور جب یہ لوگ اپنی عملی زندگیوں کا نمونہ لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کا توکل صرف خدا پر ہے تو وہ لوگ قرآن کی اس آیت کا گویا عملی نمونہ ہوتے ہیں، اور قرآن کی صداقت ان کی عملی زندگی سے ظاہر ہونے لگتی ہے، اور جب یہ لوگ مشاہدہ کرتے ہیں کہ خدا کس طرح ان کا مددگار ہو جاتا ہے تو اس کی محبت ان کے دلوں میں تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے، اور خدا کا عشق پوری طرح ان کے دلوں پر چھا جاتا ہے، تقویٰ اور توکل کی اس راہ میں کوشاں رہنے والے یہ عاشقان الٰہی صوفیہ کہلاتے ہیں، لیکن یہ تصوف کی بلند منزل ہے، دراصل ہر وہ عمل تصوف کے دائرہ میں آتا ہے، جو اللہ کے لیے مخصوص کر لیا جائے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ "اے رسول! کہہ دو کہ میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے[1]"۔

اس مسئلہ کو ایک دوسرے رخ سے دیکھیے، بدھ مذہب کے سوا ہر مذہب میں خدا پر عقیدہ لازمی ہے، مذہب والوں کے لیے اس دنیا میں خدا کی اطاعت ضروری ہے، ہر مذہب یہ بتاتا ہے کہ خدا کی اطاعت کا صلہ انعام کی شکل میں آخرت میں ملے گا، اور خدا کی نافرمانی کا انجام عذاب ہے، مختلف مذاہب میں اس انعام وعذاب کی جو بھی صورتیں ہوں، بہرحال انسان اپنے اعمال کا جواب دہ ہے، عذاب کا تصور انسان کے دل میں

[1] سورۂ انعام: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

خدا کا خوف پیدا کرتا ہے، اور خدا کے خوف سے اس کی اطاعت میں لگ جاتا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انعام کے لالچ میں خدا کی عبادت کرے، لیکن بندہ خدا کی اطاعت کرے یا نہ کرے اس سے خدا کی ذات میں کچھ فرق نہیں پڑتا، اس پہ ایمان نہ لانے سے بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی حقیقت میں کوئی فرق پڑ جائے گا، چاہے ہم اس کو رب مانیں یا نہ مانیں، وہ بہرحال رب العالمین ہے، یہ تصور کہ وہ ہمارا رب ہے، رزّاق ہے، پالن ہار ہے، ہماری شرافت نفس کو جگاتا ہے، جنھیں خدا کے انعامات، اور اپنی شرافت نفس کا احساس ہے، وہ خدا کی محبت میں غرق ہو جاتے ہیں، اگر جنت اور جہنم نہ بھی ہوتے تب بھی وہ اپنے سب سے بڑے محسن اور رب العالمین کی اطاعت کو شرافت نفس کا تقاضا سمجھتے، وہ اگرچہ اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں، کیونکہ خدا غنی، بے نیاز اور مالک حقیقی ہے، وہ ہماری عبادتوں کا محتاج نہیں ہے، وہی حق ہے، اسی کے زندہ رکھنے سے سب زندہ ہیں اسی کے انعامات سے سب بہرہ مند ہیں اور اسی کے پاس سب کو لوٹ کر جانا ہے[1]، یہ جذبہ فطری طور پر محبت کا داعیہ پیدا کرتا ہے، ایک ناسمجھ بچہ اپنے والدین سے محبت کرنے لگتا ہے، اس کا سبب اس کا صرف یہ احساس ہے کہ وہی اس کے مربی، محافظ اور جائے پناہ ہیں، لیکن حقیقی محافظ اور پناہ دینے والا خود خدا ہے، اور وہی رب ہے، یہ تصور کچھ لوگوں کے دلوں میں محبت اور اطاعت کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے، اور درحقیقت شرافت نفس کا تقاضا بھی یہی ہے، خدا کی محبت میں عبادت کرنے والے یہ لوگ صوفیہ کہلاتے ہیں، جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہے، جیسا کہ خود خدا کا فرمان ہے کہ ”اے رسول! کہہ دو کہ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو تو اللہ تم سے

[1] سورۂ بقرہ: إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ (اور بہت سی آیات اس معنی میں ہیں)

محبت کرے گا“[1]

شریعت اور عشق کے مجموعہ کا نام طریقت ہے[2]، اور صوفیہ عاشقانِ الٰہی ہیں، تمام صوفیہ کی زندگیاں اس پہ گواہ ہیں، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی زندگی عشق کا نہایت ممتاز نمونہ ہے، یہاں تک کہ انھیں وجود میں عشق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور ان کا وہ روحانی فیض تھا کہ ان کے مریدین کے دلوں میں بھی عشق کی شمع روشن ہو جاتی تھی، حضرت بندہ نوازؒ کے مرشد حضرت نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی کا ارشاد ہے ؎

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد   واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

تصوف کی تعریف جو صوفیہ نے مختلف انداز میں کی ہے، یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کی بتائی ہوئی ان تعریفوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، ایک ہی چیز کی تعریف مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔

[1] سورۂ آل عمران: ۳۱، قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔

[2] تصوف کی اساس عشق ہے، صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جذبۂ عشق نہایت نمایاں نظر آتا ہے، اور اللہ کے ساتھ رسولؐ کا عشق اور ان کی وارفتگی کا بیان خود قرآن میں ہے، جس طریقہ کی اساس قرآن اور سنت میں موجود ہے اسے اسلام سے مغایر نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ عین اسلام ہے، یہ جذبۂ عشق جب صرف خواص میں رہ گیا تو عام لوگوں سے ممتاز کرنے کے لیے ایک الگ اصطلاح وضع کرنی پڑی جس کا نام تصوف ہے، مومن کی صفت قرآن میں بھی یہی بتائی گئی ہے کہ وہ عشق الٰہی میں سرشار رہتے ہیں، مثلاً وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ کے ساتھ قوی محبت ہے) (سورۂ بقرہ ۱۶۵ اردو ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانویؒ) اور محبت میں شدت کا نام ہی عشق ہے، اسی طرح ایک جگہ یوں کہا گیا ہے کہ رسول مومنین کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ

یہاں تصوف کا تعارف مختصر طریقہ سے کرایا گیا ہے، اس میں جس نقطۂ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تصوف دین فطرت کے مطابق ہے، اور اس کے بنیادی اصول قرآن سے ماخوذ ہیں، لیکن جب اس کی تفصیلات سے بحث کی جاتی ہے تو اور بہت سے موضوعات کے ساتھ اس کا ایک موضوع ترک دنیا بھی آتا ہے، کیونکہ توکل سے ترک دنیا کا گہرا رشتہ ہے، دنیا کیوں پیدا کی گئی ہے؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے، دنیا کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ یہ سب تعلیمات ہمیں قرآن اور حدیث میں ملتی ہیں، اور قرآن وحدیث سے ہٹ کر تصوف میں دنیا کا کوئی تصور نہیں ہے، صوفیہ نے دنیا سے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ سب ہمیں قرآن وحدیث میں ملتی ہیں، مثلاً قرآن میں اس طرح کی آیات ہیں: دنیا آزمائش کی جگہ ہے، تاکہ یہ عیاں ہو جائے کہ کس نے اچھے اعمال کیے اور کس نے برے[1]، اور مال اور اولاد تمھارے لیے آزمائش ہیں[2]، اور اے رسول! کہدو کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لیے ہے[3]، اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳): محبوب ہیں، (اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کا مقصود بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے شدت محبت یعنی عشق ہے، اور یہی تصوف ہے۔

[1] سورہ کہف، اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّہَا لِنَبْلُوَہُمْ اَیُّہُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ اور سورہ ملک ۲: اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔

[2] سورۃ الانفال، ۲۸: وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ اور سورہ تغابن۔ آیت ۱۵: اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ [3] سورۂ انعام ۱۶۲: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے[1]، دنیا کی زندگی محض دھوکے کا اسباب ہے[2]، احادیث بھی بہت ہیں، ایک حدیث ہے کہ دنیا کی محبت برائیوں کی جڑ ہے، (حب الدنیا رأس کل خطیئۃ) ان تمام آیات واحادیث کا نچوڑ یہی ہے کہ دنیا دار عمل ہے، وہ عمل جو صرف اللہ کے لیے ہو، اور دنیا کی محبت کے لیے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے، اسی کا نام ترک دنیا ہے، لیکن صوفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے ترک دنیا کی اصطلاح سے غلط فائدہ اٹھا کر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صوفیہ بے عمل تھے، انھوں نے تمدنی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیا، اگر ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو دنیا مادی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی، ان اعتراضات میں بڑی بڑی غلط فہمیاں ہیں، ہم اس مضمون میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے، جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لیے میں سفارش کروں گا کہ وہ میرا مضمون مقام صوفیہ ملاحظہ فرمائیں، جو "اللطیف" دہلی میں شایع ہو چکا ہے، یہاں ہم صوفیہ کی عملی زندگی اور ان کی بعض تعلیمات کو پیش کر کے دکھائیں گے، کہ صوفیہ نے دنیا کی عملی زندگی میں کس طرح حصہ لیا، البتہ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ صوفیہ کا ہر عمل خالصۃً للہ ہوا کرتا تھا، صوفیہ نے بالعموم کوئی نہ کوئی پیشہ کسب کے لیے اختیار کیا ہے، اور جو لوگ فتوح پر بسر کرتے تھے وہ اس لیے تھا کہ ایک تو یہ جائز ہے، دوسرے بعض حالات میں ان کا قبول نہ کرنا خدا کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے، تیسرے وہ اس میں سے صرف اتنا لیتے تھے جو ان کی نہایت اہم ضرورتوں کے لیے کافی ہو، باقی دوسروں پر خرچ کر دیتے تھے، اور دوسرے دن کے لیے بچا کر نہ رکھتے تھے، دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کا نام

---

[1] سورہ نساء ۷۷: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ [2] سورۃ الحدید ۲۰: وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

تصوف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال تین طرح کے ہیں، ایک وہ اقوال جن پر آپؐ نے خود عمل کیا اور دوسروں کو ان پر عمل کرنے کا حکم بھی دیا، دوسرے وہ اقوال جن میں بہت سے کاموں کے کرنے سے منع کیا ہے، یعنی یہ دونوں آپؐ کے اوامر ونواہی ہیں، تیسرے وہ اعمال جنھیں آپؐ نے کیا، لیکن نہ ان کے کرنے سے منع کیا اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا، مثلاً آپؐ اپنے لیے کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے[1]، یہ توکل کا

[1] فتح خیبر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے ہر ایک کے لیے اسّی وسق کھجور اور بیس[2] وسق جو سالانہ مقرر کر دیے تھے اور دودھ کے واسطے ہر ایک کے لیے ایک ناقہ شیر دار ملا کرتی تھی، لیکن ازواج مطہرات کا بھی یہ حال تھا کہ مایحتاج رکھ کر بقیہ یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیتی تھیں" (رحمۃ للعلمین از قاضی سلیمان منصور پوری حصہ اول) لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھایا، اور کبھی فاقہ کا شکوہ کسی سے نہیں کیا، ناداری حضورؐ کو غنا سے زیادہ پیاری تھی، بھوک کی حالت میں بھی اگلے دن روزہ رکھ لیتے تھے' میں حضورؐ کے فاقہ کی حالت دیکھ کر رو پڑتی اور کہا کرتی دنیا میں سے اتنا ہی قبول کر لیجیے کہ جسمانی طاقت رکھنے کو کافی ہو، تو جواب میں فرماتے: عائشہ! مجھے دنیا سے کیا کام، میرے بھائی اولوالعزم رسول تو اس سے زیادہ حالت پر صبر کیا کرتے تھے، اور اسی حال پر چلے اور خدا کے سامنے گئے، خدا نے ان کا اکرام کیا اور ان کو پورا پورا ثواب دیا، اب اگر میں آسودگی کی زندگی بسر کرتا ہوں تو مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کل ان سے کم رہ جاؤں، دیکھو جو چیز مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے بھائیوں اور خلیلوں سے جا ملوں (رحمۃ للعلمین حصہ دوم) اس واقعہ کے ایک ماہ بعد رسول اکرمؐ دنیا سے پردہ فرما گئے (ایضاً: ۲) یعنی رسول اکرم سید عالم رحمۃ للعلمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی ساری زندگی اختیاری فقر میں گذری۔ (بقیہ حاشیہ آگے صفحہ ۴۷ پر)

بہت بلند مقام ہے، قرآن میں مال خرچ کرنے کا پہلا حکم یہ آیا ہے کہ جو کچھ بچے وہ دوسروں پر خرچ کر دو[1]، بعد میں زکوٰۃ کا حکم آنے پر یہ حکم منسوخ ہوگیا، اور یہ بھی کہا گیا کہ نہ اپنے ہاتھوں کو بالکل بند کر دو اور نہ بالکل کھول دو، لیکن دوسرے حکم کے آنے کے بعد بھی پہلے حکم کا استحباب باقی رہا، اس لیے اجلۂ صوفیہ نے پہلے حکم پر عمل کیا جو معالی الامور سے ہے۔

اس سے یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ کل کے لیے کچھ بچا کر رکھنا صوفیہ کی تعلیمات کے خلاف ہے یا تمام بڑے صوفیہ نے بچا کر نہیں رکھا، یہ معاملہ دراصل حالات، وقت اور سب سے بڑھ کر نیت پر موقوف ہے، کسب اور مال کا رکھنا توکل کے منافی نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اصل چیز جو کہ گناہوں کی جڑ ہے وہ حب دنیا ہے، اس طرح ایک بادشاہ بھی صوفی ہو سکتا ہے اور ایک تاجر بھی، یا اور کوئی جائز پیشہ رکھنے والا بھی، توکل کی مزید توضیح کے لیے صوفیہ کے کچھ اقوال آگے بیان کیے جائیں گے۔

اب غور کیجیے کہ ایک مدرس درس دیتا ہے تو اس کا معاوضہ لیتا ہے، سپاہی، تاجر، صنعت و حرفت والے سبھی اپنے نفع کے لیے کام کرتے ہیں، صوفیہ نے روحانی اور اخلاقی تعلیمات دیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیا، انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا کہ آپؐ اپنے کاموں کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے،

صوفیہ کے اہم ترین اصولوں میں ہے کہ فرض عبادات کے بعد سب سے زیادہ ضروری اور بڑا کام خدمت خلق ہے، خدمت خلق اور دوسروں کی حاجت روائی اور وہ بھی صرف

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶) حضرت بندہ نواز گیسو دراز اپنے ایک مکتوب میں اپنے مرید و خلیفہ شیخ علاء الدینؒ کو لکھتے ہیں: "عطا کرنا اور ایثار کرنا صوفی کا کمترین حال ہے، اور کمترین حال میں سے بھی سب سے کمتر چیز یہ مال کا خرچ کرنا ہے، جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہو اسکا درہم بھی تنہا نے پائے کہ اگر خرچ کر دیا تو توکل کیا ہوگا، اپنا پیشہ اور طریقہ کار توکل علی اللہ بنا سے۔"

[1] سورہ بقرہ، آیت ۲۱۹ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔

رضائے الٰہی کے لیے وہ عمل ہے جس پر ایک صالح معاشرہ اور بابرکت تمدن کا انحصار ہے، درحقیقت صوفیہ نے تمدنی زندگی کی ان بنیادوں کی آبیاری کی ہے جس سے شجرِ انسانیت ہرا بھرا رہ سکتا ہے، آج اس کی کمی کے سبب انسانیت گمراہ رہی ہے، خدمتِ خلق ہی کا ایک خاصہ ہے کسی کے دل کو تکلیف نہ دینا، کیونکہ جب دوسروں کے دلوں کو راحت پہونچانا سب سے بڑی نیکی ہے تو دوسروں کے دلوں کو تکلیف پہونچانا سب سے بڑی برائی ہے، یہ وہ زریں اصول ہے جس کی بنیاد ہی پر انسانی سماج میں انسانیت کا احترام ممکن ہے، جس کی آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے، خدمتِ خلق ہی کا وہ تصور ہے جس کی وجہ سے صوفیہ نے عوام کے لیے ان اعمال پر زور دیا ہے جن سے لوگوں کی مادی ضروریات پوری ہوتی ہیں، مثلاً زراعت، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ، صوفیہ میں ہر شخص کو جس طرح کے مواقع حاصل رہے انھوں نے خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دیا، صوفیہ نے بادشاہوں، امیروں، وزیروں، حاکموں، عالموں، جاہلوں، تاجروں اور کسانوں سبھی کو اپنی تعلیمات و ہدایات سے نوازا ہے، اور سبھی لوگ صوفیہ کے معتقد تھے، لیکن یہ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ صوفیہ نے ان لوگوں کو دنیاوی امور سے کنارہ کشی کی تعلیم دی ہو، وہ علماء جن کو تزکیہ نفس کے لیے ریاضت و مجاہدہ کی تعلیم دی گئی وہ اس لیے زیادہ ضروری تھا کہ وہ لوگوں میں تبلیغ و ارشاد کا کام بہتر طور پر انجام دے سکیں، اس کے علاوہ ان لوگوں کے روحانی ذوق کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا جس کے بغیر روحانی ترقی ناممکن تھی، صوفیہ کی تعلیمات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عشقِ حقیقی کی لذت، قلب کے سوز و گداز اور دوسروں سے ہمدردی کے بغیر ریاضت و مجاہدہ سودمند نہیں ہوتا۔

صوفیہ کے یہاں توکل اور ترکِ دنیا کا کیا مفہوم ہے، اور انھوں نے عملی زندگی پر کس طرح زور دیا ہے، اس کے لیے ہم چند اقتباسات ان کی تحریروں سے ذیل میں پیش کرتے ہیں،

حضرت سید اشرف جہانگیرؒ (متوفی در حدود ۸۲۹ھ) شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ (م ۷۳۶ھ)

سے نقل کرتے ہیں، طوالت کے خیال سے صرف ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:-

"جو لوگ زراعت اور صنعت و حرفت کے دوسرے کاموں میں مصروف ہیں وہ اتنے ثواب کا کام کرتے ہیں جس کا بیان نہیں ہو سکتا، خدا نے دنیا اس لیے پیدا کی ہے تاکہ یہ آباد رہے اور ترقی کرتی رہے، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کے لوگوں کی بھلائی کے کام کرنا کتنا بڑا کارِ ثواب ہے تو لوگوں کے فلاح کے کام ترک کرنا کوئی پسند نہ کرے گا، اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ قابلِ کاشت زمین کو بے کار اور بغیر کاشت کے چھوڑ دینا کتنا بڑا گناہ ہے تو کوئی بھی تخریب کے کام کرنا پسند نہ کرے گا، اگر کسی کے پاس اتنی زمین ہے کہ اس سے ایک ہزار من غلہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اس کی کاہلی یا بے توجہی کی وجہ سے ایک سو من کم غلہ پیدا ہوا تو اس کے لیے قیامت میں اسے جوابدہ ہونا پڑے گا، اس سے صرف وہی شخص مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے جو خدا کی محبت میں ایسا جذب ہو جسے خود اپنا ہی ہوش نہ ہو اور وہ دنیاوی امور کی طرف توجہ دینے کے قابل نہ رہ گیا ہو، لیکن اگر وہ صرف اپنی کاہلی کی وجہ سے ان امور کی طرف توجہ نہ دے سکا اور اسے وہ زہد و تصوف کہتا ہے، تو وہ مقلد شیطان ہے، اور دنیا کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ بے کار شخص کاہل ہے، دنیا کی خوشحالی اور ترقی بادشاہوں اور حاکموں کی کوششوں اور ان کی نیک دلی سے بہت زیادہ وابستہ ہے" (لطائف اشرفی)

اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے:

"تمام بادشاہ، امراء، وزراء، کسان اور تمام لوگ جو مختلف صنعت و حرفت اور پیشوں میں لگے ہوئے ہیں، درحقیقت وہ عبادت میں مصروف ہیں، اور راہ سلوک کے سالک ہیں، بشرطیکہ وہ خدا کے فرماں بردار ہوں، اس کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں، دنیا کو ایک خانقاہ

زمین گرد، خدا اس کا مرشد ہے، انبیاء خدا کے خلفاء اور نائب ہیں، اولیاء خدا کے دوست ہیں جو انبیاء کے نیچے اور ان کے تابع ہیں، بادشاہ اور دنیادار ملازمین ہیں انبیاء اور اولیاء کے جو خانقاہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف ہیں، کسان مزدور اور تمام پیشے والے مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے ہیں، اس طرح انسان کا کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو خدا کے دوستوں کی خدمت میں مصروف نہیں ہے۔" (لطائف اشرفی)

محبوب یزدانی سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے ایک مرید سیف خاں جو اودھ میں کہیں حاکم تھے انھوں نے امارت ترک کر کے گوشہ نشینی اور فقر کی زندگی اختیار کرنی چاہی تو آپ نے منع کیا اور کہا کہ اصل مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا ہے، یہی مقصود زندگی ہے، (لطائف اشرفی) اور پھر انھوں نے غنا کی فضیلت پر ایک رسالہ بھی لکھا، شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں فقر و غنا پر ایک دلچسپ مکالمہ لکھا ہے اور غنا کی فضیلت بتائی ہے، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور ان کے معاصر صوفیہ میں کئی ایسے تھے جو امراء اور بادشاہوں کی اصلاح میں مصروف تھے۔

حضرت سید اشرفؒ جہانگیر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ صرف ہندوستان میں نظر آیا کہ یہاں کے بہت سے پیرزادے محنت اور کسب کو عیب سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے مفلوک الحالی میں مبتلا ہیں، حالانکہ کسی پیشہ کی توہین کرنا گویا کفر ہے، کیونکہ جتنے بنیادی صنعت و حرفت کے کام ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی نبی نے کیا ہے، (مثلاً زراعت، تجارت، حدادی، نجاری وغیرہ آج کے بہت سے پیشے جو اس زمانہ میں نہ تھے وہ سب اسی اصل کی فرع ہیں) اور نبی کے کاموں کی توہین نبی کی توہین ہے اور نبی کی توہین کفر ہے۔ (لطائف اشرفی)

حضرت بندہ نواز گیسو دراز اپنی کتاب اسمار الاسرار کے سمر دوازدہم میں لکھتے ہیں:

"توکل حقیقت میں یہ ہے کہ ایک مرد صوفی اگر ستر سال حرفت، صنعت و تجارت میں مشغول رہے تب بھی اس کا نفس خدا سے غافل نہ رہے، اس کا توکل صرف خدا پر ہو، اپنے قول و فعل پر اس کی نظر نہ ہو، بلکہ مسبب الاسباب ہی کو فاعل حقیقی سمجھے، اور سوائے اس کے کسی کو نہ دیکھے نہ جانے (یعنی یہ نہ سمجھے کہ رزق اس کی اپنی محنت سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اسے خدا کی دین اور اس کا فضل جانے)

سیر الاولیاء ص ۵۴۴ ۵۵ (مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ترک دنیا کے متعلق مرقوم ہے، اس سے ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ اپنے کو ننگا کر دے اور لنگوٹہ باندھ لے، ترک دنیا یہ ہے کہ کھائے، پہنے، پہنائے، کھلائے اور شکستہ دلوں اور محتاجوں کو فائدہ پہونچائے اور اس کے باوجود اپنا دل دنیا سے نہ لگائے، ہمت بلند رکھے اور شہرت کی طمع نہ رکھے۔"

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سہ صدی میں (مطبع اسلامی لاہور ۱۳۱۹ھ) مکتوب پنجم بنام شیخ عمر ترک دنیا سے متعلق ہے، اس کے ایک اقتباس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، ہم نے جو وضاحت اپنی طرف سے کی ہے، اس کو قوسین میں لکھ دیا ہے:

"جان لو کہ جو کچھ دنیا میں ہے اس کی تین صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے دنیا ہے، یعنی ایسا فعل جس میں خدا کی اطاعت کی نیت بالکل نہیں ہے، یہ سراسر معصیت ہے، اور بزرگوں نے مباحات کی کثرت کو بھی اسی

ورع میں داخل کیا ہے، کیونکہ مباح چیزیں بھی نفس کی خاطر ہیں، جس طرح کہ تمام معصیت کے کام نفس کے سبب ہیں (مباحات کی کثرت کا سبب بھی لذات نفسانی کی کثرت ہے، جو انسان کو خدا سے غافل کرتی ہے، اور دنیا میں مشغولیت کا سبب بنتی ہے) دوسری صورت وہ ہے کہ بظاہر خدا کی اطاعت میں ہو، لیکن نیت و قصد حصول دنیا ہو، مثلاً ترک شہوات، تاکہ لوگ اسے زاہد سمجھیں، اور علم کا حاصل کرنا تاکہ لوگوں میں اعزاز و افتخار حاصل ہو، اور اس سبب سے دنیا حاصل ہو، اور اسی طرح کی چیزیں سب ملعون ہیں، اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ خدا کے لیے ہیں، یہاں سلامتی اس کے ترک کرنے میں ہے، (یہاں ترک علم سے مراد وہ علم ہے جو فقط دنیا وی جاہ و مرتبہ اور تفاخر کے لیے حاصل کیا جائے، ورنہ فرائض و واجبات کا علم بقدر ضرورت ہر ایک پر فرض ہے، اور یہ سب کو عام ہے، اس کے علاوہ قرآن میں کائنات پر غور و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے جو حصول علم ہی کا طریقہ ہے، لیکن اس کا مقصد بھی حرص دنیا اور تفاخر نہیں ہے) تیسری قسم وہ ہے کہ بظاہر دنیا ہے لیکن بباطن خدا کی اطاعت ہے، یہ ملعون نہیں ہے، جیسے غذا کھانا، پانی پینا اور سونا وغیرہ تاکہ عبادات کے لیے قوت حاصل ہو سکے، اور نکاح کرنا تاکہ حرام میں نہ مبتلا ہو اور کچھ اسباب فراہم کرنا تاکہ وہ طاعت و عبادت میں خلق کا محتاج نہ رہے اور ہر وہ کام جس کا مقصد آخرت کی بھلائی ہے وہ دنیا نہیں ہے، خواہ بظاہر دنیا نظر آئے۔

علماء نے دنیا کی چیزوں کو تین درجات میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ جو ضرورت ہے مثلاً کھانا، کپڑا، مکان وغیرہ بقدر ضرورت، (جن کو ضروریات زندگی کہہ سکتے ہیں) دوسرے بقدر حاجت (جس سے آدمی کو کچھ راحت مل سکتی ہے اور قوت کار بڑھ جاتی ہے اور

کام زیادہ سہولت سے اور بہتر طور پر انجام پاتے ہیں) تیسرے وہ ہے جو حاجت سے زیادہ ہو، جس کا مقصد تجمل، تفاخر اور ذخیرہ اندوزی ہے، اس کی کوئی حد نہیں ہے جیسے ہاویۂ دوزخ کی کوئی حد نہیں ہے، اس کا ترک لازم ہے (اس کو تعیشات زندگی کہہ سکتے ہیں)

جس نے دنیا سے مقدار ضرورت لیا اس نے نجات پائی، کیونکہ اس قدر دنیا سے لینا معاف ہے، جس نے ضرورت سے بڑھ کر حاجت طلب کیا اس کے لیے خطرہ ہے (اس لیے کہ مباح چیزوں کی کثرت اس کو عیش پسندی کی طرف لے جا سکتی ہے، اس لیے بقدر حاجت طلب کرنے میں اعتدال اور سخت ہوشمندی کی ضرورت ہے) اور جس نے تجمل و تفاخر اور تکاثر اختیار کیا وہ دوزخ میں جا گرا (اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ..... الخ)

اسی مکتوبات سہ صدی میں مکتوب ہفتم بنام شیخ عمر میں فرماتے ہیں:

"ہر فقر کہ جس کا مطلوب حق ہے غنا ہے، اور ہر غنا جو طلب حق کے لیے ہو وہ فقر ہے، وہ غنا جس کو فقر پر فضیلت ہے وہ نعمت کے سبب نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ نعمت کے ذریعہ منعم کا طالب ہے (مطلب یہ ہے کہ دولت کو اگر رضائے الٰہی کے لیے خرچ کیا جائے تو ایسی دولت اس فقر سے بہتر ہے جس میں بندہ مخلوق کا محتاج ہو جائے اور حقیقت میں مخلوق کی محتاجی کا نام فقر نہیں ہے، بلکہ فقر وہ ہے کہ بندہ مکمل طور پر اپنے کو خدا کے سپرد کر دے اور کلیۃً خالق کا محتاج ہو جائے۔)

مکتوب دہم میں شیخ عمر کو لکھتے ہیں:

"اگر کسی کی ملک میں ساری دنیا ہو لیکن اس کی محبت اس کے دل میں نہ ہو، اور طاعت و عبادت اور خیرات و حسنات میں وقت گذارتا ہو تو ایسے شخص کے لیے ملکیت رکھنے میں کوئی

حرج نہیں ہے۔"

مکتوب بست و ہفتم میں شیخ شمس الدینؒ کو لکھتے ہیں:

"نوافل کی زیادتی سے اپنے کو زحمت میں نہ مبتلا کرو، جو تم پر دوسرے شرعی حقوق ہیں ان کو ادا کرو، یہ بھی دین کا اہم کام ہے، تھوڑا وظیفہ لیکن قانون کی پابندی اور استقامت کے ساتھ کرنا بہتر ہے ایسے وظائف سے جو زیادہ ہوں لیکن مستقل مزاجی، حضور قلب اور پابندیٔ وقت سے نہ ہو۔"

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری مکتوبات سہ صدی میں مکتوب ہفتاد و پنجم میں لکھتے ہیں:

"امام احمدؒ ابن حنبل سے روایت ہے کہ زہد تین طرح کا ہے، ایک حرام چیزوں کا ترک، اور یہ زہد عوام ہے، دوسرے زائد از ضرورت حلال چیزوں کا ترک، اور یہ زہد خواص ہے، تیسرے ایسی چیزوں کا ترک جو بندہ کو حق کی یاد سے غافل کرتی ہے اور یہ عارفوں کا زہد ہے۔"

حضرت قطب ویلور باوجودیکہ مرتبۂ قطبیت پر فائز تھے لیکن خود کھیتی کے کاموں میں بھی مصروف رہتے تھے، ان کھیتوں کی پیداوار مدرسہ پر صرف کی جاتی تھی، (انوار اقطاب ویلور اور اللطیف، اقطاب ویلور نمبر وغیرہ) الحمد للہ یہ روایت آج بھی خاندان اقطاب ویلور میں زندہ ہے،

ہندوستان میں ابتدا میں صوفیہ نے تصنیف و تالیف کی طرف خاص توجہ نہ دی، سید علی ہجویریؒ نے البتہ کئی کتابیں لکھیں جن میں سے اس وقت صرف کشف المحجوب موجود ہے، اور یہ بھی ان کے بہت بعد منظر عام پر آسکی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی صرف کتاب الاوراد دریافت ہوسکی ہے جو چھپ گئی ہے، یہ کتاب صرف وظائف اور دعاؤں پر مشتمل ہے، ابتدا میں

چشتی صوفیہ کے بعض مختصر ملفوظات کا پتہ لگتا ہے، لیکن تصنیف و تالیف، مکتوبات و ملفوظات کے اعتبار سے ہندوستان میں چودھویں صدی عیسوی کا زمانہ (آٹھویں صدی ہجری) سب سے زیادہ تابناک ہے، اس دور میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ) سید محمد گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ) سید علی ہمدانی (متوفی ۷۸۶ھ) سید اشرف جہانگیر (متوفی در حدود ۸۲۹ھ) کی شخصیتیں اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی صوفیہ کی اہم تصانیف ملتی ہیں، ان بزرگوں کی تحریریں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بادشاہوں، امراء اور حکام کی اصلاح، خدمت خلق، لوگوں کی حاجت روائی، علماء کی روحانی تعلیم و تربیت، عوام کے اخلاقی اور دینی جذبہ کے فروغ، انسانیت اور ہمدردی کی اشاعت، مخلوق سے محبت اور انسانیت کے احترام کو عام کرنے میں اپنی زندگیاں صرف کردیں، اور انھوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد نہ جاہ و اقتدار تھا، نہ دولت و ثروت، نہ اعزاز و اکرام، شیخ علاء الدین پنڈوی (متوفی ۸۰۰ھ) فرماتے ہیں کہ سورج کی طرح فیاض، زمین کی طرح بردبار اور پانی کی طرح خاکسار ہو، (اخبار الاخیار در ضمن حالات شیخ علاء الدین پنڈوی) دراصل یہ چشتی صوفیہ کی بنیادی تعلیمات میں ہے، چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا قول سیر الاولیاء ص ۵۶ میں اس طرح منقول ہے

"جس کے اندر یہ تین خصلتیں ہوں تو سمجھ لو کہ خدا اس کو دوست رکھتا ہے، اول سخاوت میں مانند دریا ہو، دوسرے شفقت میں مانند آفتاب، تیسرے تواضع میں مانند زمین ہو۔"

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آج انسان کے تمام معاشی اور معاشرتی مسائل کا حل صوفیہ کی ان ہی تعلیمات میں مضمر ہے، آج دولت ہی عزت کا معیار ہے، لوگ اپنے ہی عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں، دولت اور جاہ و اقتدار کا حصول زندگی کا مقصد

بن گیا ہے، ذخیرہ اندوزی اور حصول نفع کے لیے مصنوعی گرانی اور مہنگائی روز کا معمول ہے، انسان انسان کا دشمن نظر آتا ہے، طاقتور کمزوروں کو کچل دینے کے درپے ہے، ان حالات میں ضرورت اور حاجت کے مطابق لینا اور بقیہ غریبوں کے لیے چھوڑ دینا، جاہ و اقتدار کی ہوس چھوڑ کر مخلوق کی خدمت کرنا، ہر شخص کو حصول معاش کے مواقع دینا، اور کسی کو اسکے حق سے محروم نہ کرنا، تمام انسانوں سے محبت رکھنا، ترقی و خوشحالی کے لیے پیداوار کو بڑھانا اور پھر اس کی منصفانہ تقسیم، یہ وہ اصول ہیں جن پر عمل کر کے دنیا فلاح پا سکتی ہے، درحقیقت انسان کے اخلاقی اور معاشی مسائل کا حل نہ کمیونزم کے پاس ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہے، آج دنیا کو صوفیہ کے دکھائے ہوئے راستہ کی سخت ضرورت ہے، اور اسی راستے سے دنیا فلاح پا سکتی ہے۔

بزم صوفیہ

مغل دور سے پہلے کے صاحب تصنیف و صاحب قلم اکابر صوفیہ مثلاً حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدینؒ ناگوریؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا سہروردیؒ، حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ، حضرت خواجہ فرید الدینؒ گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت شیخ بو علی قلندرؒ، حضرت ابو الفتح رکن الدینؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ، حضرت ضیاء الدین بخشیؒ، حضرت خواجہ نصیر الدینؒ، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت شیخ عبد الحق توشہ ردولویؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل ان ہی بزرگوں کے ملفوظات اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، آخر میں ضمیمہ کے تحت دو اور مضمون کا بھی اضافہ ہے، یعنی ملفوظات خواجگان چشت اور ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ پر ایک نظر، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، قیمت ۳۴ روپیے۔

کلکتہ میں فارسی ادب کا مطالعہ

از

پروفیسر عبد السبحان شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی

فارسی زبان سے اہل کلکتہ کی دلچسپی سے نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان میں فارسی ادب کی ترقی میں بڑی مدد ملی ہے، اگرچہ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے ملک کے شمالی و مغربی حصوں میں فارسی کا چلن ہو چکا تھا، لیکن مشرقی ہندوستان میں فارسی کا رواج دیر سے شروع ہوا، یہ ضرور ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے بعد سے بنگال میں فارسی تاریخ نویسی کا فروغ ہوا، لیکن جہاں تک کلکتہ کا تعلق ہے اس شہر میں فارسی زبان و ادب کے مطالعہ کی طرف عوام کے رجحان کا پتہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے قبل نہیں ملتا ہے۔

بنگال کے ضلع مرشد آباد میں نواب مرشد قلی خان کے زیر قیادت آزاد نظامت کے قیام کے باعث انگریز کلکتہ میں کثرت سے آکر بسنے لگے اور رفتہ رفتہ مسلم حکمرانوں کی فارسی تہذیب و روایت بنگال کے رسم و رواج اور معاشرے میں سرایت کرنے لگی، ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد شہر کلکتہ عوام کی مزید توجہ کا مرکز بن گیا اور امراء و رؤسا کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک لوگ بھی یہاں آباد ہونے لگے، اس صورت حال نے ایک موافق فضا تیار کر دی جس کی وجہ سے انگریز حکمراں نہ صرف فارسی سیکھنے پر مجبور ہوئے بلکہ اس کی ترویج و اشاعت کی سرپرستی کی، کیونکہ محکوم نو آبادیوں میں مروج رابطے کی زبان صرف فارسی

ہی تھی۔

فورٹ ولیم کالج اور فارسی ادب

۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی کی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج معرض وجود میں آیا، اس ادارہ نے برطانوی ہندوستان میں فارسی زبان کی تحصیل و ترویج کیلئے[1] ایک ہمت افزا دور کا آغاز کیا۔ اگرچہ اردو جسے اہل یورپ "ہندوستانی" کہا کرتے تھے سرکاری سطح پر نشوونما پاکر اپنی شعاعیں اطراف و جوانب میں بکھیر رہی تھی، بایں ہمہ انگریز حکمرانوں کی ناگزیر ضرورتوں کی تکمیل اور ان کے انتظامی امور میں ایک موثر اور نتیجہ خیز حصہ ادا کر کے ایک خاص مقام حاصل کر چکی تھی، فورٹ ولیم کالج کے پہلے سربراہ ڈاکٹر گلکرسٹ[2] بذات خود ایک عظیم دانشور تھے جن کی علمی جدوجہد ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ شہر کلکتہ میں مشہور شعراء اور ادباء کی ایک خاصی تعداد جمع ہو گئی تھی جو فارسی وارد و ہر دو زبانوں میں افسروں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیے جاتے تھے، ان ادیبوں میں میر امن دہلوی، حفیظ الدین احمد، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان، مولوی اکرام علی اور مرزا علی لطف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، فارسی کے اعلیٰ ادبی شاہکار مثلاً چہار درویش، تاریخ جہاں کشائے نادری، طوطی نامہ، عیار دانش اور گلستاں وغیرہ فارسی زبان سے اردو اور پھر انگریزی زبان میں منتقل کیے گئے، ان قدیم فارسی تصانیف کے اردو تراجم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کے یوروپین اساتذہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ فارسی کے منشیوں کا انتخاب کرتے تھے، اور اس عہدے کے امیدوار ہندوستان کے مختلف حصوں

---

[1] فارسی مطالعہ کے لیے فورٹ ولیم کالج کی خدمات کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر ایس۔ کے داس کی کتاب "صاحب اور منشی" مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۶۸ء۔

[2] گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے متعلق دیکھیے محمد عتیق صدیقی کی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۰ء۔

سے آیا کرتے تھے، مولوی اللہ داد جو منشیوں کے سربراہ تھے، لکھنؤ کے باشندہ تھے، جبکہ دیگر معاونین منشی جیسے بہادر علی، کرم حسین اور نظر اللہ مظفر پور، اودھ اور مرشد آباد سے تعلق رکھتے تھے، شعبۂ فارسی فورٹ ولیم کالج کا ایک نہایت اہم اور باوقار شعبہ سمجھا جاتا تھا، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان فارسی شاعری کے دلچسپ اور عمدہ موضوعات پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر بھی ہوا کرتا تھا، ۱۸۰۲ء میں طلبہ نے ایک مجلس مباحثہ منعقد کی تھی، جس کا موضوع بحث حافظ کی شاعری میں عشق کا تصور مجازی ہے یا حقیقی" تھا، ۱۸۰۹ء اور ۱۸۱۱ء کے درمیان شعبۂ فارسی کی جانب سے منتخب فارسی نظم و نثر کی چھ[6] جلدیں شایع کی گئیں، جن میں شیخ سعدی کی "گلستاں" اور "بوستاں" شامل تھیں، ۱۸۱۱ء میں فردوسی کی شاہکار تصنیف "شاہنامہ" اور ۱۸۱۲ء میں نظامی گنجوی کی تصنیف "سکندر نامہ" شایع کی گئیں، ۱۸۰۶ء میں منشیوں نے فارسی اور عربی الفاظ پر مشتمل "شمس اللغات" کے نام سے ایک لغت ترتیب دیا، اور دو[2] سال بعد ایک روایتی عربی لغت "منتخب اللغات" کا فارسی ترجمہ شایع کیا گیا، کالج کے مشہور استاد فرانسس گلاڈوین نے فارسی قواعد کی دو[2] کتابیں بعنوان "پرشین گائڈ" اور "پرشین منشی" تصنیف کیں، ۱۸۱۸ء میں کالج کے عارضی سکریٹری کپتان تھامس روبک نے اپنے ہندوستانی رفقاء کے تعاون سے ایک مشہور فارسی لغت "برہان قاطع" کی تالیف کی، کالج کے فارسی شعبہ سے منسلک مشہور یوروپین اساتذہ میں جیمس ایٹکنسن، لفٹننٹ اسٹین ماتھولسٹن، جان ہارنگٹن، ڈبلو کرک پاٹرک، ڈبلو آئی اوسلی، چارلس اسٹوارٹ اور جان لیڈن قابل ذکر ہیں، فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں مقامی بنگالی ادباء جو کالج سے منسلک تھے مثلاً تارنی چرن مترا نے فارسی ادبی تصانیف کی اشاعت و ترویج میں مکمل کوشش کی تھی۔

ایشیاٹک سوسائٹی اور فارسی زبان ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے تقریباً تیس ۳۰ سال تک کالج میں فارسی زبان و ادب کی سرپرستی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی "کلکتہ مختلف زبانوں کے علاوہ فارسی زبان و ادب کے مرکز کی حیثیت سے نہایت وسیع پیمانے پر اہم خدمت انجام دیتی رہی، اس سوسائٹی کی بنیاد مشہور مستشرق سر ولیم جونس[1] نے ڈالی تھی، سوسائٹی میں فارسی کے بیش قیمت اور نایاب قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس سلسلہ میں سر ولیم جونس نے خود اقدام کیا، اور ان کی "فارسی قواعد" مشرقی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، اس سے پیشتر اس طرح کی کوئی تصنیف منظر عام پر نہیں آئی تھی، پروفیسر آربری کے الفاظ میں ولیم جونس کا "پرشین سانگ آف حافظ" (حافظ کے فارسی نغمات) فارسی مطالعہ کی ترویج کے لیے ایک عظیم عطیہ ہے، بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سوسائٹی نے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں فارسی کے نایاب نسخوں کی تحقیق کا کام اپنے ذمہ لیا، اس مقصد کے حصول کے لیے دور دراز سے علماء بلائے گئے، جو نایاب اور نادر قلمی نسخوں کی جانچ کرتے اور ان کی علمی حیثیت متعین کرتے، فارسی ادب کے مشہور مستشرق VLADIMIR IVANOW (متوفی سنہ ۱۹۷۰ء) نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں گذارا، اور ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر آنجہانی سر آشوتوش مکھرجی کی بدولت سوسائٹی میں فارسی نسخوں کے فہرست نگار کی حیثیت سے مقرر کیے گئے تھے، ایوانوف نے ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی نسخوں کی ایک جامع توضیحی فہرست مرتب کی جو آج تک محققین کے لیے ناگزیر حوالہ کا کام دیتی ہے[2]، فارسی کے نایاب نسخوں پر تحقیقی کام اور اس کی اشاعت کے

---

[1] سر ولیم جونس کی حیات اور کارناموں کے سلسلہ میں انگریزی میں گارلینڈ کینن کی نگارشات اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [2] توضیحی فہرست مخطوطات فارسی ایشیاٹک سوسائٹی مولفہ ڈبلیو ایوانوو کلکتہ ۲۶-سنہ ۱۹۲۴ء

سلسلہ میں سوسائٹی کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، مشہور BIBLIOTHECA - INDICA SERIES - کے تحت فارسی تواریخ، تذکرے، سوانح حیات، جغرافیہ، اور ادب کی نوّے سے زائد کتابیں اب تک شایع کی جاچکی ہیں، ان میں تاریخ فیروز شاہی، تاریخ مسعودی، طبقات ناصری، منتخب التواریخ، اقبال نامۂ جہانگیری، بادشاہ نامہ، عالمگیر نامہ وغیرہ ملک کے عہد وسطیٰ کی تاریخی تحقیقات میں بنیادی اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، فارسی زبان و ادب کے موضوعات پر بہت سارے تحقیقی مقالے سوسائٹی کے مشہور و معروف جرنل کی زینت بنتے رہے ہیں جو اہل علم کے لیے ایک نفع بخش اور غیر فانی تحفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلکتہ میں بعض انگریزوں کی فارسی خدمات کلکتہ میں انگریزوں اور دیگر باشندوں کے ادبی مشاغل ہی کا نتیجہ تھا کہ اس شہر میں فارسی زبان و ادب کے مطالعہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، انتظامی امور میں زبان کے عمل دخل سے ان کے اندر اس زبان کو سیکھنے کے ذوق میں اس قدر اضافہ ہوا کہ وہ اپنی زبان دانی پر فخر محسوس کرتے تھے، ہندوستانی دانشوروں اور عالموں کی صحبت میں رہ کر یوروپین اسکالر بھی فارسی شعراء، تنقید نگاروں، قواعد اور لغات نویسوں کی صف میں شمار کیے جاتے تھے، ان میں سے بعض شخصیتوں کی کوششیں نہایت دلچسپ ہیں، سر جان شور (۱۷۵۱ - ۱۸۳۴ء) جو سر ولیم جونس کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی کے منصب صدارت پر فائز ہوئے، فارسی زبان و ادب کے صرف دلدادہ ہی نہیں بلکہ اس زبان میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی، اور بلا تکلف اس زبان میں گفتگو کرنے کے علاوہ بسا اوقات شعر خوانی بھی کرتے تھے، گرینر (LT. COL. IAMES GRINNER) (۱۷۷۸ - ۱۸۴۱ء) نے ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود فارسی ادب میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، دوسری قابل ذکر ہستی ہنری لوئس ڈیروزیو کی ہے، جو کسی زمانہ میں ہندو کالج

میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، فارسی کے ممتاز شعراء میں ان کا نام لیا جاتا ہے،
انھوں نے حافظ کی غزلوں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے، ان کے ہم عصروں میں ڈے کوسٹا
جو ڈوٹن کالج سے منسلک تھے اور SOOKI KIN GTRECT میں قیام پذیر
تھے، فارسی کے اچھے عالموں میں سے تھے، ایڈورڈ ہنری پامر (متوفی ۱۸۸۲ء) اور تھامس
ولیم بیل (متوفی ۱۸۷۵ء) کلکتہ کے نامور فارسی اسکالروں میں شمار کیے جاتے تھے —
WILLIAM NASSAU ۔ (۱۸۹۳-۱۸۱۳) ALLOY GPOENGER
BLOCHMANN HENRY اور ۔ (۱۸۸۹ء-۱۸۲۵) LESS
FERDINAND (۱۸۷۸ء-۱۸۳۸) ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۸ء تک یکے بعد دیگرے
کلکتہ مدرسے جو اس وقت ہندوستان میں اسلامی تعلیم کی پہلی درسگاہ تھی، بحیثیت پرنسپل
وابستہ رہے، اسپرنگر نے جو کچھ دنوں تک ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری تھے،
اور سرکاری ملازمت میں بحیثیت مترجم کام کر چکے تھے فہرست سازی اور فارسی کی نادر کتابوں
کی تالیف میں ایک نمایاں خدمت انجام دی ہے لیس (ادعھ لے) جو فن سپہگری کے ماہر تھے
کئی سال تک فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت فارسی مترجم کام کرتے رہے، ایشیاٹک سوسائٹی
آف بنگال کے جرنل میں بلوچ من (BLOCHMANN) کے شایع شدہ عالمانہ مقالات فارسی
زبان وادب کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے،

| فارسی کی ترقی میں کلکتہ مدرسہ اور دوسرے مدرسوں کا حصہ |

دو سو سالہ قدیم کلکتہ مدرسہ نے بھی فارسی زبان وادب کی ترقی
میں قابل تحسین خدمات انجام دی ہیں، اس مدرسہ کے مشہور
سابق اساتذہ میں ملا معین الدین، مولانا محمد وجیہہ، مولوی اللہ داد، مولوی عبدالحق حقانی،
مولوی عبدالرحیم صفی پوری، مولوی لطف الرحمٰن بردوانی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولوی اسحاق

بردوانی، آغا احمد علی، مولانا صفی اللہ سرحدی، مولانا ولایت حسین، مولوی ہدایت حسین،
مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا ابو الحفاظ، علامہ عبدالرحمٰن کاشغری اپنے وقت کے قابل ذکر
فارسی ادبا اور شعراء میں شمار ہوتے ہیں[۱]، مدرسۂ عالیہ کے علاوہ چند دوسری دینی درسگاہیں
بھی تھیں جن میں منتخبات فارسی داخل نصاب ہوا کرتا تھا، بنگال میں گورنمنٹ کے ماتحت
چلنے والا مدرسہ تعلیمی بورڈ وقتی تقاضے کے تحت ان مراکز علوم کا بہترین طور پر نظم و نسق
کرتا آرہا ہے۔

| انیسویں صدی کے کلکتہ کے مشہور اہل قلم |

انیسویں صدی میں کلکتہ کے فارسی مصنفین میں سب سے پہلے
عبدالغفور نساخ کا نام لیا جاتا ہے جو عام طور پر بنگال میں "اردو
شاعری کے جد امجد" شمار کیے جاتے ہیں[۲]، نساخ نے فارسی زبان میں بے شمار نظمیں لکھی ہیں،
نساخ کی فارسی تالیفات میں فارسی رباعیات کا ایک عمدہ مجموعہ "مرغوب دل" فریدالدین
عطار کے "پند نامہ" کا ایک شاہکار ترجمہ "چشمۂ فیض" فارسی شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل
"قند فارسی" اور فارسی کے ہمعصر شعراء کا تذکرہ موسوم بہ "تذکرۃ المعاصرین" قابل ذکر ہیں، اس
عہد کے مشہور فلسفی عبدالرحیم گورکھپوری معروف بہ دہری ایک معروف شاعر تھے، اور کئی
کتابوں کے مصنف بھی تھے، فرہنگ دبستان، پند نامۂ بہرامی، کارنامۂ حیدری، حکایاتِ
عبرت آیات وشگرف بیان عبرت توامان ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں، عبدالرحیم ٹیپو سلطان
کے شاہی گھرانے سے قربت رکھتے تھے، جس کے نمایندہ شہزادوں میں بشیرالدین توفیق اور
شہزادہ اعظم الدین سلطان بذات خود فارسی کے ممتاز اور باصلاحیت شعراء میں شمار کیے

---

[۱] "تاریخ مدرسۂ عالیہ"، مولفہ عبدالستار ڈھاکہ ۱۹۵۹ء۔ [۲] "نساخ: حیات و تصنیف"
(اردو) مولفہ ڈاکٹر محمد صدرالحق کراچی ۱۹۸۰ء۔

جاتے ہیں، عبدالرحیم کے مشہور شاگرد عبیداللہ عبیدی سہروردی (۱۸۳۴ء۔ ۱۸۸۵ء) ایک مشہور ادیب اور شاعر مانے جاتے تھے، ان کی کتاب "دستور زبان فارسی آموز"[1] جو پانچ جلدوں میں ہے، فارسی سیکھنے کے لیے مفید کتاب مانی جاتی ہے، عبیدی کا فارسی دیوان جو شاہکار نظموں اور مدحیہ اشعار پر مشتمل ہے عبیدی کی شاعرانہ صلاحیت کا ایک بہترین ثبوت ہے عبیدی نے کچھ عرصہ تک ایک ہفتہ وار فارسی رسالہ "دوربین" کی ادارت بھی سنبھالی تھی، جو اس عہد کے سب سے مشہور و معروف شاعر ابوالمعالی عبدالرؤف وحید کی براہ راست نگرانی میں کلکتہ سے شایع ہوتا تھا، عبدالرووف وحید نے فارسی زبان میں کلکتہ کی ایک مختصر تاریخ بعنوان "تاریخ کلکتہ" لکھی ہے جس میں اس شہر کی تعریف میں ان کے مندرجۂ ذیل دلکش اشعار موجود ہیں[2]:

چیست دانی تو شہر مینو چہر   شہر نزہت فزائے کلکتہ
غمزدا، جاں فزا، روان پرور   چیست آب و ہوائے کلکتہ
بر زمینے ز باغِ خلدِ بریں   گویا شد بنائے کلکتہ
کردہ ہر درد را مسیحائی   دم باد صبائے کلکتہ
در دمد روح در تن بیجان   روح راحت فزائے کلکتہ
نی دہد بوئے گلشنِ فردوس   چمن خوش ہوائے کلکتہ
نور چشم و سرور جان و دل   طلعت دل ربائے کلکتہ
گرہ از دل کشائے نافہ چین   نکہت مشک سائے کلکتہ

---

[1] "دستور فارسی آموز" مصنفہ عبیدی آگرہ ۱۹۸۲ء۔ [2] تاریخ کلکتہ مولفہ عبدالرووف وحید کلکتہ ۱۸۹۱ء۔

غیرتِ روئے دلبرانِ صبح   صبح ہر دل کشائے کلکتہ
رشک زلفِ معنبر خوباں   شام جادو نمائے کلکتہ
اے خوشا آبِ گنگ نزہت جاں   شیرۂ جانفزائے کلکتہ
واں عمارات پُر بہائے رفیع   شان و شوکت نمائے کلکتہ
عقدِ غم واکشائے جان حزیں   گل زمین فضائے کلکتہ
یاد باغِ جناں برد از دل   باغِ بستاں سرائے کلکتہ
دلِ پاکان با صفا بہ کشد   ساحتِ پُر فضائے کلکتہ
رخنہ در زہد زاہداں فگند   صنم خوش ادائے کلکتہ
دلِ کرد بیاں بردار جائے   بتِ زہرہ لقائے کلکتہ
طائر جان ناتوانِ وحید   می پرد در ہوائے کلکتہ

محمد نصیرالدین حیدر سامی[1] نے فارسی میں ایک معرکۃ الآرا کتاب موسوم بہ "سہیل یمن" لکھی[2]، جو حضرت شاہ جلال سلہٹی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، سامی نے شہر کلکتہ کی تعریف میں فارسی و عربی مصرعوں پر مشتمل ایک طویل مدحیہ نظم بھی لکھی ہے، جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

خوشا خاکِ کلکتہ مصر العجائب   مناخ المطایا، مرسی المراکب
مجلّی مناظر، معلّی منازل   مصفّا شوارع، موشح مذاہب
مناجاتیاں را مقامے موافق   خراباتیاں را محلّی مناسب

---

[1] "سلہٹ میں اردو" مصنفہ عبدالجلیل بسمل کراچی ۱۹۸۱ء [2] "سہیل یمن" مصنفہ نصیرالدین حیدر سامی کلکتہ، ۱۹۱۱ء۔

ارم را بہ ایں شہرِ رنگیں چہ نسبت — چہ نسبت بود حاضرے را بغائب

بہارش ندارد خزانے مرادف — کمالش ندارد زوالے معاقب

بیوتش ز قسمت بجنت معارض — قصورش برفعت فلک را مصاحب

زبادش معطر مشامِ ملائک — ز خاکش کمل عیونِ کواکب

خوشا گلرخانِ فرنگی نژادش — صباحؐ، حسانؐ، ملاحؐ، کواعب

پیادہ چو شمعِ فروزاں بہ بزمی — سوارہ کبرق، رمیض السحائب

شموس الخدود، بدور المحافل — اسود المناظر، طیار الملائب

خوشا دل ستانانِ ہندو نژادش — کمل عیون و مقوس حواجب

ببالا چو سروی، برفتن تذوری — بدنداں چو گوہر، بہ لب لعلِ ذائب

یہودی زبانِ مسلماں فریبش — ہمہ قالبِ جاں، ہمہ جانِ قالب

جگر خون کند دل برنگیں انامل — کمند افگن جاں بمشکیں ذوائب

شکر پاش طوطی ز لعلِ مقند — جگر کاوِ آہو بچشمِ محارب

چوں فرعون سرمست از جامِ نخوت — چوں موسیٰ ہمہ مبدعات الغرائب

بہ از ابن مریم نبات لب شاں — بہ از دستِ موسیٰ صفائے ترائب

بہاں شہر کلکتہ اے جاں فدایت — سیناً تفوت، عداد المحاسب

انیسویں صدی کے اواخر میں کلکتہ کے ایک معزز شہری محمد عبدالرحمٰن سعید نے جو کملا کے باشندہ تھے، فارسی نظموں کا ایک مجموعہ کلکتہ سے شایع کیا تھا، جس میں کلکتہ سے متعلق یہ طویل نظم بعنوان "ترانہ سنجی عندلیب خامہ در گلشن توصیف شہر کلکتہ" موجود ہے۔[1]

[1] "ریحان سعید" مصنفہ عبدالرحمٰن سعید، کلکتہ ۱۹۳۶ء۔

سرم سرشارِ شوقِ گلستانِ شہرِ کلکتہ — دلم محوِ ادائے گلرخانِ شہرِ کلکتہ

ربود از دل قرار و طاقت و تاب و توانم — نگاہِ سحر آمیزِ بتانِ شہرِ کلکتہ

برنگِ لالہ دل پُر خون شد و در سینہ می دارم — ہزاراں داغِ ہجرِ گلرخانِ شہرِ کلکتہ

بیغما بردہ رختِ دین و ایمان در دل و جانم — فغاں از چشمِ مستِ ساقیانِ شہرِ کلکتہ

دل درد آشنائے اہل الفت ہست و در ہر سو — شکار عشوہ کند طلعتانِ شہرِ کلکتہ

نیازِ عاشقانِ ناتواں یکسو تماشا کن — سوئے دیگر ببیں نازِ بتانِ شہرِ کلکتہ

چہ بے باکند در تاراجِ صبر و طاقتِ دلہا — فغان از بیخ کلاہانِ جوانِ شہرِ کلکتہ

چہ می پرسی سعید از حالِ زارِ من کہ دل خوں شد — ز نازِ بے نیازیِ بتانِ شہرِ کلکتہ

چہ لذتہا کہ حاصل می شود عشرت پرستاں را — کنارِ جوئبارِ بوستانِ شہرِ کلکتہ

برقص و وجد می آرد دلِ ہر پیر و برنا را — نوائے جان فزائے مطربانِ شہرِ کلکتہ

مشامِ جانِ اصحابِ محبت تازہ می دارد — شمیمِ دل کشائے گلستانِ شہرِ کلکتہ

خرامِ گلرخان در گلشن انداز عجب دارد — نثارِ جلوہ شانِ عاشقانِ شہرِ کلکتہ

معطرؔ ساختہ یکسر دل و جان و دماغم را — شمیمِ خلقِ ہر طفل و جوانِ شہرِ کلکتہ

فریدونِ زماں، جمشید دوراں، قیصر آواں — بشان و عز و جاہ اند افسرانِ شہرِ کلکتہ

فلک رفعت، فلک حشمت، فلک صولت، فلک شوکت — بود ہر یک ازیں فرماں دہانِ شہرِ کلکتہ

ہزاراں داغِ حسرت بر دلِ نوشیرواں باشد — ز وصفِ عدل و دادِ حاکمانِ شہرِ کلکتہ

بود انگشتِ حیرت در دہانِ حاتمِ طائی — ز صیتِ بذل و جودِ باذلانِ شہرِ کلکتہ

سرِ خود بر فلک دارند از فرطِ علوِ شان — قصورِ عالیٔ گردوں نشانِ شہرِ کلکتہ

اجازت کے دہند از بہر سیرِ گلشنِ جنت — قصورِ دل کشِ خلد آستانِ شہرِ کلکتہ

رساں بادِ صبا در ہر دیار و ملک و ہر شہرے　　پیامِ جاں فزا از این و آنِ شہرِ کلکتہ

وجود عالمانِ دین و فیض مدرسہ باشد　　کمالِ افتخارِ مردمانِ شہرِ کلکتہ

بباغ علم و فن گل می کند صد غنچۂ معنیٰ　　نسیم علم و فضلِ فاضلانِ شہرِ کلکتہ

ہمہ دلہائے ظلمت آشنا را ساخت نورانی　　فروغ شمع علم عالمانِ شہرِ کلکتہ

ز نورِ نیران اوج علم و دیں تواں گفتن　　زمینِ مدرسہ را آسمانِ شہرِ کلکتہ

فروغِ مدرسہ باشد ز استادانِ علم دین　　کہ زیشان ہست فخر و عز و شانِ شہرِ کلکتہ

نہال باغ علم و فضل و فن شاداب می باشد　　ز انفاسِ لطیف عالمانِ شہرِ کلکتہ

نشان علم و فن باقی بہ بنگالہ نمی باشد　　ز فیض ہمتِ ایں ماہرانِ شہرِ کلکتہ

سخن را جلوہ بخشد باہزاراں معنیِ رنگیں　　بہار نظم و نثر شاعرانِ شہرِ کلکتہ

بہ میدانِ فصاحت گوئے سبقت بردہ از یکجاں　　فصیحانِ بلاغت پروران شہرِ کلکتہ

ز عالی ہمتی مسکن نمودہ در خمِ گردوں　　حکیمانِ فلاطوں آستانِ شہرِ کلکتہ

نکوصورت، نکو سیرت، نکو طلعت، نکو خصلت　　بود ہر یک ز جمع طالبانِ شہرِ کلکتہ

ادائے دیگرے داریم در تحصیلِ علم و فن　　کہ می گیریم درس از عالمانِ شہرِ کلکتہ

سعید از فضل می جوئی بشو ایں یک بجان و دل　　فدائے نامِ پاکِ فاضلانِ شہرِ کلکتہ

اگر تحصیلِ علمِ دیں بخواہی عمر خود را کن　　نثار لطف علم عالمانِ شہرِ کلکتہ

سزد بر خود اگر نازم کہ بخت یاورم کردہ　　غلامِ کمترین عالمانِ شہرِ کلکتہ

فراز آسمان ہفتمیں باشد دماغ من　　کہ ہستم بہرہ ور از کاملانِ شہرِ کلکتہ

روا باشد اگر در جملہ فن نازم مہارت را　　کہ گشتم خاکپائے ماہرانِ شہرِ کلکتہ

غبارم بہر چشمانِ بصیرت توتیا باشد　　کہ ہستم نقش پائے رہروانِ شہرِ کلکتہ

دلِ دیوانہ و جانِ حزینِ خود ہمی سازم　　فدائے لطف ہر خورد و کلانِ شہرِ کلکتہ

سعید از ہر دو چشم من چکد خون چوں بیاد آرم　　خیالِ درد ہجر دوستانِ شہرِ کلکتہ

ایک دوسری غزل میں سعید نے شہر کلکتہ سے اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار اس طرح کیا ہے :

من ز کلکتہ بداغِ ہجر یاراں می روم　　با ہزاراں حسرت و اندوہ حرماں می روم

فارسی زبان کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ اس کی سرپرستی کلکتہ کے صوفیائے کرام نے بھی کی، صوفی سید فتح علی شاہ[1] جن کا مزار مانک تلہ میں مرجع خاص و عام ہے اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے، اور رومی، حافظ، خاقانی، عرفی اور فیضی جیسے ممتاز فارسی شعراء کی زمینوں میں خوب خوب غزلیں کہی ہیں۔

شاہ عبید اللہ بغدادی جن کا مزار کلکتہ کے جنوب مشرق میں بمقام کرسٹو فر روڈ پر واقع ہے، فارسی کے ایک اچھے شاعر اور مصنف تھے، ان کے جانشینوں میں شاہ عبدالرحمن فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے، فارسی ادب اور اسلامی تعلیمات کے فروغ و اشاعت میں کلکتہ کے علاقہ تالتلہ میں واقع خانقاہ عالیہ قادریہ نے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس خانقاہ شریف کے متصل ایک خوبصورت اور قیمتی کتب خانہ واقع ہے جو حضرت صاحبِ سجادہ کی ملکیت ہے، کلکتہ کی اس تاریخی خانقاہ کے بانی حضرت سیدنا مولانا سید شاہ مرشد علی القادری البغدادی تھے، جو دنیائے اسلام کے عظیم روحانی پیشوا حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے خاص نسبت رکھتے تھے، اور انیسویں صدی کے اواخر میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے شہر کلکتہ میں تشریف لائے، اور اردو اور فارسی زبان میں معرکۃ الآرا شاعری

---

[1] "آئینۂ ویسی" مصنفہ محمد مطیع الرحمن، پٹنہ، ۱۹۷۶ء

کی اور مخصوص موضوعات پر چند رسالے بھی تصنیف فرمائے، ان کی اردو شاعری پر لکھنوی رنگ اور فارسی شاعری پر حافظ و رومی کا اثر غالب ہے، اس دبستانِ تصوف میں ہمیشہ فارسی شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا، کلکتہ کا یہ مایۂ ناز سلسلۂ قادریہ اطراف بنگالہ، بالخصوص بردوان اور مدنا پور میں اردو کے ساتھ ساتھ علوم فارسی کی ترویج و اشاعت میں بہت اہم اور موثر رہا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل کے ایک شاعر ذوالفقار علی مست نے جن کا کچھ دنوں کلکتہ میں قیام رہا، ریاض الوفاق[1] کے عنوان سے ایک فارسی تذکرہ لکھا جس میں ان ادبار و شعراء کا ذکر ہے جنھوں نے تلاش معاش میں ملک کے مختلف حصوں سے آکر کلکتہ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، ان میں مولوی نجم الدین احمد خان نقیب، شیخ ولادر علی ولی، عابد علی عابد، سراج الدین علی خان اور عبد الباری مضطر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ مرزا خلیل اللہ خان برطانوی دور حکومت کے شروع ہی میں بحیثیت فارسی سفیر دار السلطنت کلکتہ تشریف لائے تھے، اور اپنے شاعرانہ ذوق اور اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بدولت ہندوستان کے مسلم دانشوروں میں اپنا ایک اعلیٰ درجہ بنا لیا تھا، ایک ایرانی نژاد شاعر قمر الدین منت نے جو ملک الشعراء کہلاتے تھے، کلکتہ ہی میں بود و باش اختیار کر لی تھی، اور بقول نساخ ان کو ایک لاکھ سے زائد نظمیں لکھنے کا شرف حاصل تھا، دیانا تھ پنڈت رنگین، رتن لال غریب اور مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کلکتہ کے وہ مشہور و معروف غیر بنگالی فارسی شعراء ہیں جن کی ادبی خدمات کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بنگالی ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے ہندو سماج کے ایک عظیم رہنما ہونے کے علاوہ فارسی کے ایک نامور ادیب بھی تھے،

[1] "ریاض الوفاق" مولفۂ ذوالفقار علی مست تبریز (ایران) ۱۳۴۳ شمسی۔

ان کی تصنیف "تحفۃ الموحدین"[1] جو قدیم فارسی طرز پر عربی مقدمہ کے ساتھ لکھی گئی فارسی زبان و ادب پر ان کی دستگاہ کی نشاندہی کرتی ہے، راجہ جنم جے مترا (راجہ جندر لال مترا کے والد) اردو اور فارسی کے ایک باصلاحیت ادیب تھے، "نسخۂ دلکشا"[2] اور "منتخب التذکرہ" ان کی دو اہم تصانیف ہیں، کلکتہ میں ٹیگور خاندان کو فارسی زبان و ادب کے ساتھ جو لگاؤ رہا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، بنگلہ کے نامور ادیب دیبندر ناتھ ٹیگور خواجہ حافظ کی صوفیانہ شاعری کے ایسے دلدادہ تھے کہ انھیں حافظِ حافظ کہا جاتا ہے، ان کے ہونہار بیٹے رابندر ناتھ ٹیگور بھی فارسی کے عظیم صوفی اور فلسفی شاعر حافظ کے جامِ عشق سے سرشار تھے، اور ۱۹۳۲ء میں اپنے قیام ایران کے زمانہ میں حافظ کے مزار پر حاضری دے کر اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے تھے۔

فارسی زبان میں کلکتہ کی صحافت | بنگال کا یہ شہر یعنی کلکتہ جسے محلوں کا شہر کہا جاتا ہے ہندوستان میں فارسی اخبار نویسی کی جائے پیدائش بھی ہے، جس وقت انگریزی زبان اچھی طرح رائج نہ تھی اور صحافتی مقاصد کے لیے مستعمل نہیں تھی، فارسی زبان ہی نہایت طمطراق کے ساتھ مقبولیت کا سہرا باندھے چل رہی تھی، ۱۸۳۰ء تک عوام میں یہ زبان سفارتی روابط اور عدالتی و دفتری امور کی تکمیل کی خاطر ایک موثر ذریعہ بنی ہوئی تھی، فارسی کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما"[3] جو آٹھ صفحات پر مشتمل ایک ہفتہ وار رسالہ تھا، کلکتہ کے ایک انگریزی تجارتی ادارہ کی جانب سے شایع ہوتا تھا جس کے پہلے مدیر منشی لالہ سدا سکھ اور بعد میں منشی ہری ہر دت مقرر ہوئے، ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا، جس میں ہندوستانی زبان استعمال کی گئی تھی، لیکن یہ اخبار اپنی

[1] "تحفۃ الموحدین" (انگریزی ترجمہ) مترجم العبیدی کلکتہ ۱۸۸۳ء۔ [2] "نسخۂ دلکشا" مولفہ جنم جے مترا ارمان کلکتہ ۱۸۰۷ء۔ [3] "جامِ جہاں نما اور ہری دت" مصنفہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، ماہنامہ "آج کل" دہلی، جون ۱۹۶۳ء۔

اشاعت کے دو ماہ کے بعد فارسی زبان میں تبدیل ہو گیا، "کلکتہ جنرل" اپنے اداریہ میں اس تبدیلی پر یوں رقمطراز ہے:

"ہندوستانی زبان باوجودیکہ بول چال کی حیثیت سے عوامی مقبولیت کی زبان سمجھی جاتی ہے، لیکن تحریر میں اس زبان کا ذوق ملک کے باشندوں میں کم ہی ہے، اس لیے جو لوگ صرف ہندوستانی زبان ہی سے واقفیت رکھتے ہیں ان سے کسی مقامی اخبار کی حمایت کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے بہ نسبت اُن لوگوں کے جو فطرتاً فارسی زبان میں تحریر کردہ کسی اخبار کو ترجیح دینا چاہتے ہوں، چونکہ فارسی زبان شریف الطبع لوگوں کی تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے۔"

کلکتہ جرنل کے یہ الفاظ بنگال میں فارسی کی ترویج کے حق میں ایک نہایت جامع تبصرہ ہے، مذکورہ جرنل نے وقتاً فوقتاً فارسی نظموں اور غزلوں سے اپنے اخبار کو مزین کیا۔

"جام جہاں نما" کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا ہفتہ وار "مرآۃ الاخبار" کے نام سے منظر عام پر آیا، اس اخبار کے شمارہ مورخہ ۲۰ راپریل ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کھل کر فارسی کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"انگریزی چونکہ ہندوستان کے تمام حصوں میں سمجھی نہیں جاتی ہے اور اس سے ناآشنا لوگ ایک دوسرے کی معاونت سے قاصر ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر میں جو کہ طبقہ انسان میں سب سے زیادہ منکسر المزاج ہوں اس بات کی دلی آرزو رکھتا ہوں کہ فارسی میں ایک ایسا ہفتہ وار رسالہ کا اجراء کروں جو ملک کے تمام حصوں کے معزز طبقات کے درمیان سمجھا اور مانا جا سکے۔"

۱۴ رمارچ ۱۸۲۳ء کو قائم مقام گورنر جنرل آدم (ADAM) کے توسط سے ایک نئے پریس آرڈی ننس کے تحت نہایت مختصر مدت میں اس اخبار نے ایک قابل تعریف اور

اصلاح پسند روش اختیار کر کے صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا، جن فارسی رسائل کو لائیسنس فراہم کیے گئے، ان میں "شمس الاخبار" اور "ماہ عالم افروز" قابل ذکر ہیں، شمس الاخبار منی رام ٹھاکر کی ادارت میں علاقہ کلنگا کے شیخ علیم اللہ کے توسط سے شایع ہوتا تھا، جب کہ "ماہ عالم افروز" تاللہ کے علاقے سے وہاب الدین نامی ایک شخص کے زیر ادارت شایع ہوتا تھا، دوسرے قابل ذکر ہفتہ وار رسائل "آئینۂ سکندر"، "سلطان الاخبار" اور "مہر منیر" فارسی زبان ہی میں مرکزی کلکتہ سے شایع ہوتے تھے، ۱۸۹۳ء میں کالج اسٹریٹ کلکتہ کے علاقہ سے "حبل المتین" نام کا ایک نہایت پر زور، انقلابی اور ترقی پسند فارسی ہفتہ وار اخبار کا اجراء ہوا جس کی ادارت کے فرائض سید جلال الدین کاشانی مؤید اسلام انجام دیتے تھے، ملک اور بیرون ملک میں ایک نہایت اہم، مؤثر اور مقبول فارسی اخبار کی حیثیت سے "حبل المتین" بیش سال سے زائد عرصہ تک فارسی زبان کی خدمت انجام دیتا رہا، حبل المتین پریس نے کئی کتابیں شایع کرنے کے علاوہ فارسی اخبارات "مفتاح الظفر" اور "آزاد" کی بنیاد ڈالی، جو علی الترتیب ۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء میں کلکتہ سے شایع ہونا شروع ہوئے، سید جلال الدین کاشانی کے بھائی سید حسین کاشانی ان کے مدیر تھے۔

موجودہ دور میں انقلابات کے باوجود فارسی کے معاملہ میں کلکتہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پہلے تھی، شہر کلکتہ فارسی اور عربی کے جید عالم مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، کلکتہ یونیورسٹی، مولانا آزاد کالج اور لیڈی برابورن کالج میں فارسی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام ہے، ایران سوسائٹی کلکتہ گذشتہ چالیس سال سے اپنے سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا اور دیگر مفید فارسی مطبوعات کے ذریعہ فارسی زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے،

اس طرح ماضی میں کلکتہ کو فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت سے جو والہانہ لگاؤ رہا ہے وہ آج بھی برقرار ہے۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ قضاۃ و مفتیانِ بھوپال:- مرتبہ مولانا سید عابد علی وجدی الحسینی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۵ روپیہ - پتہ بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اسلام میں قضا کے نظام کی ضرورت و اہمیت دکھائی ہے، اس سلسلہ میں عدل و انصاف کے بارہ میں اسلام اور اسلامی تعلیم کے امتیازات اور مفتی و قاضی کے اوصاف و فرائض کا ذکر بھی آگیا ہے، مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اسلام میں محکمۂ قضا کی داغ بیل عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی پھر اس کے مختلف مرکزوں کا ذکر کرنے کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قضا کے نظام کے قیام کی سرگذشت تحریر کرنے کے بعد ریاست بھوپال کی تاریخ اور وہاں کے نظام قضا کی روداد بیان کی ہے، دوسرے حصہ میں بھوپال کے قاضیوں اور مفتیوں کے حالات و واقعات درج ہیں، اس سلسلہ میں ۲۱ قاضیوں اور ۲۰ مفتیوں کا تذکرہ ہے، جن قاضیوں اور مفتیوں کے حالات تحریر کئے گئے ہیں ان میں بھوپال سے باہر کے افراد بھی شامل ہیں، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ کے بھوپال سے تعلق اور ان کے سلسلہ کے بعض اصحاب علم و کمال کے یہاں قضا و افتا کی خدمت پر مامور ہونے نیز علمائے یمن کے بھوپال سے تعلق اور بعض ممتاز یمنی علما کی بھوپال میں تشریف آوری اور عہدۂ قضا پر فائز ہونے کا ذکر کیا ہے۔ قضاۃ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ذکر خیر بھی ہے۔

مصنف نے اس سلسلہ کا خاتمہ خود اپنے تذکرہ پر کیا ہے، کیونکہ وہ خود بھی اس وقت بھوپال میں قاضی کے فرائض انجام دینے پر مامور ہیں۔ ان کی سعی و محنت نے بھوپال سے تعلق رکھنے والے ان سب حضرات کا نام نیک ضائع ہونے سے بچالیا ہے، جس کے لیے اہل بھوپال کو خاص طور پر ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ مگر مصنف کی اور کتابوں کی طرح اس میں بھی مواد و معلومات کی فراوانی کے باوجود بے ترتیبی اور انتشار ہے، اور انھوں نے بہت سی غیر متعلق اور غیر ضروری باتیں بھی اس میں تحریر کی ہیں۔

شورش کامل جلد اول و دوم:- مرتبہ جناب ابوالکلام خواجہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات جلد اول ۵۱۲ و جلد دوم ۳۵۲ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت جلد اول بیالیس ۴۲ روپے و جلد دوم تیس ۳۰ روپے، پتے (۱) خواجہ پیپر مارٹ چوک بازار، ملتان (۲) ربانی اشاعت گھر ۱۸/۱۴ - بیرون پاک گیٹ، ملتان۔

جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم مشہور خطیب و صحافی اور ایک خاص طرز و انداز کے پختہ مشق ادیب و شاعر تھے، ان کو دین و مذہب اور قوم و وطن سے بھی عشق تھا، اور انکی شورش و انقلاب پسند طبیعت نے انھیں ہمیشہ بے چین و بے قرار رکھا، آزادی سے پہلے ان کی زندگی انکے لیے جہاد اور دعوت انقلاب میں اور آزادی کے بعد ملک و قوم کی خدمت و اصلاح میں بسر ہوئی، جناب ابوالکلام خالد محمود خواجہ لیکچرار اردو گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ (پاکستان)، نے اس کتاب میں شورش کاشمیری مرحوم کے حالات، قومی، سیاسی و صحافی خدمات اور ادبی و شعری کارناموں کی تفصیل قلمبند کی ہے، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد تین ۳ اور دوسری جلد چار ۴ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے شورش صاحب کی وفات تک کے ان واقعات و حالات کا ذکر ہے، جن کے اثرات ان کی زندگی اور شخصیت پر مرتب ہوئے۔ مگر اس میں آزادی سے قبل کے

واقعات کا مجمل ذکر ہے البتہ قیام پاکستان کے بعد خصوصاً جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے حالات و واقعات زیادہ تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ کتاب اس دور کے حالات کی ایک دستاویز ہے، دوسرے باب میں شورش صاحب کی پیدائش سے وفات تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، گھریلو اور سیاسی زندگی کے واقعات اور قید و بند کی سرگذشت کے علاوہ ان کے اخلاق و عادات، خوراک، پاکستان سے محبت اور عشق رسول کا تذکرہ بھی ہے، اسی باب میں ملک و ملت کے سیاسی رہنماؤں اور ارباب قلم کے وہ تاثرات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ جو آغا صاحب کے متعلق ان کی زندگی میں یا وفات کے بعد تحریر کئے گئے تھے، پہلے نثری اور آخر میں منظوم تاثرات درج ہیں، تیسرے باب میں شورش صاحب کی تصانیف نظم و نثر کا مفصل تعارف کرایا ہے اس میں ہر تصنیف کی خوبیاں اور خصوصیات پوری طرح واضح کی ہیں، چوتھا باب شورش صاحب کی خطابت کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس میں ان کی خطابت کی دلکشی کو نمایاں کرنے کے لیے تقریروں کے بعض نمونے بھی دئے ہیں، پانچویں باب میں ان کی شاعری پر بسوط تبصرہ کیا ہے، اس میں موضوعات و اصناف کے لحاظ سے ان کی شاعری کی خصوصیات نمونوں کے ساتھ دکھائی گئی ہیں، چھٹا باب ان کی صحافت پر بحث و گفتگو کیلئے خاص ہے، اس میں پہلے آزادی سے قبل جن اخباروں اور رسالوں سے وہ وابستہ رہے ان کا ذکر ہے، اور آخر میں ۱۹۴۹ء میں جاری ہونے والے ان کے نجی ہفت روزہ اخبار چٹان کے مقاصد و خصوصیات بیان کرکے ان کی صحافت نگاری کی خصوصیات و خدمات پیش کی ہیں، آخری باب میں ان کی نثر نگاری پر تبصرہ ہے، جس میں مختلف اصناف نثر میں ان کے کمالات اور انوکھے اسلوب نگارش کی دلآویزی کا ذکر ہے، جناب شورش کاشمیری مرحوم کی زندگی ہنگامہ خیز، انقلاب پسند اور مجاہدانہ تھی، اس اعتبار سے یہ کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے، مگر وہ جن تحریکوں اور اشخاص سے زیادہ متاثر ہوئے ان کا مستقل ذکر ہونا چاہیے تھا،

جلد ۱۴۰ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۷ء عدد ۲

مضامین

مقالات